مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

منہج فکر و دعوت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عروبات، تکیہ کلاں، راے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع دوم

شعبان المعظم ۱۴۴۰ھ - اپریل ۲۰۱۹ء

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نام کتاب	:	مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ - منہج فکر و دعوت
مصنف	:	بلال عبدالحی حسنی ندوی
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
صفحات	:	۱۲۰ (ایک سو بیس)
قیمت	:	Rs. 80

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب، ندوہ روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام، گوائن روڈ، لکھنؤ

باہتمام: محمد نفیس خاں ندویؔ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

پیش لفظ ۵
مقدمہ ۷

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

منہج فکر و دعوت

جامعیت واعتدال ۲۵
دعوتِ دین ۲۹
معتدل فکر کی دعوت ۳۰
دین کو برسر اقتدار لانے کے دو راستے ۳۳
سلاطین وامراء کی تربیت وارشاد کے چند واقعات ۳۴
حضرت مولانا کا طریقۂ فکر ۳۸
دورِ اکبری اور حضرت مجدد صاحب کی مثال ۴۰
معاصر تحریکات کے بارے میں مولانا کا طرزِ فکر ۴۷
حضرت مولانا اور سیاست ۵۲
اقامت دین حکمت دین کے ساتھ ۵۳
تبدیلی اذہان کی نہ کہ ابدان کی ۵۶

مولانا کے اصول دعوت ۵۶
تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب-حضرات انبیاءؑ کی دعوتی زندگی میں ۶۰
اصلاح یا انقلاب ۶۳
عقیدہ وعمل کا فرق اور مولانا کا طرزِ تبلیغ ۶۵

اصحاب اقتدار اور مولانا کی اصلاحی کوششیں

سعودی عرب ۷۰
کویت ۸۰
شرق اردن ۸۳
مراکش ۸۸
یمن ۹۰
امارات ۹۱
ایران ۹۲
ترکی ۹۶
پاکستان ۹۹
ہندوستان ۱۰۶
اندرا گاندھی ۱۱۲
راجیو گاندھی ۱۱۶
وی پی سنگھ ۱۱۹
اٹل بہاری واجپئی ۱۲۰
آخری بات ۱۲۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کو اب دو دہائیاں مکمل ہونے کو ہیں، لیکن ان کی جامعیت، فکر کی آفاقیت اور حکمت و دعوت کی ضرورت آج بھی اسی طرح محسوس کی جارہی ہے، اور اسی لیے ابھی تک ان کی ذات اور دعوت و فکر پر سیمینار منعقد کیے جارہے ہیں، درجنوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، تشریح کرنے والے اپنے اپنے طور پر اس کی تشریح کررہے ہیں، اور کہیں کہیں اس میں وہ توازن باقی نہیں رہ پاتا جو حضرت مولانا کی فکر کا خاصہ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا کہ جس شخصیت نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گذارا وہ حضرت کے جانشین عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ذات گرامی ہے، جو سفر و حضر میں حضرت کے رفیق اور انتہائی معتمد رہے ہیں، حضرت تمام اہم امور میں ان سے مشورہ فرماتے تھے، اور ان کی رائے کو فوقیت دیتے تھے، انہوں نے حضرت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حضرت مولانا کی فکر کا صحیح عکس اور اس کی صحیح ترجمانی ہے۔

جامعہ اسلامیہ بھٹکل اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی کے زیر اہتمام ابھی ایک ماہ قبل جو سیمینار حضرت مولانا پر ہوا اس کے لیے اس گنہگار نے بھی ایک مقالہ

مولانا کے منہج فکر و دعوت پر تیار کیا تھا جو خاصا طویل ہوگیا اور سیمینار میں پڑھا نہیں جاسکا، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو شائع کر دیا جائے۔

اسی سیمینار میں حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم کا مقالہ انتہائی پرمغز اور جامع تھا، یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کو رسالہ کا مقدمہ بنادیا جائے، حضرت نے بخوشی اس کی اجازت مرحمت فرمادی، اب یہ رسالہ حضرت کے مقدمہ کے ساتھ ناظرین کے سامنے ہے، امید ہے کہ اس سے حضرت کی فکر و طریقۂ دعوت کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ بھی ہوگا، جو حضرت مولانا کی فکر و طریقۂ دعوت کے سلسلہ میں پیدا ہو رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مفید بنائے۔ آمین.

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مرکز الامام أبی الحسن الندوی، رائے بریلی

۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ
۱۴/ مارچ ۲۰۱۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد بن عبد اللہ الأمین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین. أما بعد!

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنے عہد میں عالم اسلام کی جامع کمالات کی حامل شخصیت تھے، انہوں نے اپنے عہد کے مسائل اور امت اسلامیہ کو درپیش خطرات کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اس کے لحاظ سے ملک وقوم کی اہم رہنمائی انجام دی تھی، ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ تاریخ وادب اور علم حدیث میں ممتاز مقام کے حامل تھے، مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو ان سے علمی ذوق وراثتاً ملا تھا اور تعلیم اس عہد کے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی تھی اور دینی وفکری صلاحیت وجامعیت کے سلسلہ میں اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ، اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنیؒ اور استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسی ممتاز وصاحب فکر وادب شخصیتوں کے تجربات اور علمی مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا تھا، علوم دینیہ میں پختہ صلاحیتوں کے حصول میں شیخ الحدیث علامہ حیدر حسن خاں ٹونکیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا سید احمد علی لاہوریؒ سے گہرا استفادہ کیا تھا، علوم عربیہ میں شیخ خلیل

عرب یمانیؒ اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشیؒ سے خصوصی فائدہ اٹھایا۔

تعلیمی مرحلہ کے بعد قرآن مجید اور حدیث شریف کی روشنی میں دعوتی کام کو اپنا موضوع بنایا، تاریخ کے موضوع میں بھی امتیاز پیدا کیا، اسلامی فکر کی تاریخ کے ساتھ مغربی مفکرین اور مغرب کی تمدنی وفکری تاریخ کا قابل اعتماد طریقہ سے مطالعہ کیا، اسلام کے اولین عہد سے ابھرنے والی علمی وفکری تحریکات اور اس کی علمی تاریخ کو بھی گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا، اسی کے ساتھ اپنے عہد میں اٹھنے والی دینی وملی تحریکات کو گہری نظر سے دیکھا اور عملی مشاورتی سطح پر ان کے ساتھ تعاون کیا، آزادیٔ ہند کے لیے کوشاں جماعتوں کو دیکھا جن میں جمعیت علماء ہند پیش پیش تھی، اس کے بزرگ رہبروں کی فکر وتوجہ کو سمجھا اور اظہار قدردانی محسوس کی جماعت اسلامی کے کام کو سمجھا اور اس کے مفید پہلو کو سراہا، تبلیغی جماعت کے کام کو دیکھا اور اس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ سے قریبی ربط رہا اور ان کے موثر کام کی افادیت کی قدر کی اور شرکت کی۔

مولانا کو روحانی دائرہ میں وقت کے ممتاز شیوخ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، ان کے شیخ خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، حضرت شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، شام کے موقر بزرگ شیخ ہارون العسل الحجارؒ، شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے ربط رہا، خاص طور پر مولانا عبدالقادر رائے پوری سے ؒ خصوصی استفادہ کا تعلق رہا، مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے اجازت وخلافت بھی حاصل ہوئی، اس طرح ان کو جامع شخصیت بننے میں بڑی مدد ملی۔

حضرت مولانا کو طالب علمی اور تربیتی مدت میں سرپرستی ایسی شخصیتوں کی ملی جن کی سرپرستی سے مولانا کی ذہنی اور انسانی مزاج کی تشکیل میں ضبط واعتدال کا خصوصی وصف پایا گیا، ابتدائے عمر میں والدہ صاحبہ نے دینی اور اخلاقی پختگی اور عادلانہ مزاج بنانے کا اہتمام کیا تھا اور نصیحتیں ایسے انداز سے کیں اور پابند کیا کہ مولانا کو اپنے دل چاہے مزاج کا بننے نہیں دیا، مثلاً مولانا کے خاندانی معاصرین اور قریبی اعزہ میں

جدید علمی ومغربی مزاج کے مطابق علم وادب کو اختیار کرنے کا رجحان تھا، مولانا اس رجحان کے اثر کو دیکھتے ہوئے انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے تو والدہ صاحبہ نے مولانا کی ایسی ذہن سازی کی کہ اس رجحان میں دینی روح غالب ہوئی۔

والدہ صاحبہ کے علاوہ مولانا کے بھائی جو مولانا سے عمر میں بیس سال بڑے تھے اور علوم دینیہ اور علوم عصریہ کے جامع ہونے کے اثر سے فکر ورجحان کی جامعیت کے حامل اور دینی روح کے لحاظ سے اپنے مرحوم والد صاحب کے مثنی تھے، انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو والد مرحوم کے موجود نہ ہونے کو محسوس ہونے نہیں دیا اور شفقت ومحبت کے ساتھ پورا کنٹرول کیا اور وقت کی عظیم دینی وعلمی شخصیتوں سے تعلق واستفادہ کی طرف توجہ دلائی اور اس طرح مولانا کے لیے ایسا ماحول بنا دیا کہ مولانا میں ہمہ جہت خوبیاں پیدا ہوئیں اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں سے مولانا کو استفادہ کا موقع ملا اور مولانا میں علمی وفکری لحاظ سے ترقی یافتہ اور اعتدال پسند صلاحیت پیدا ہوئی اور اپنے عہد کے معیاری حیثیت کے بڑوں سے استفادہ کا مزاج بنا جو مولانا کی فکر وعمل میں تاحیات قائم رہا، مولانا اپنے عہد کی عظیم دینی شخصیتوں کے یہاں چھوٹے بن کر جاتے اور مستفیدانہ انداز سے ملتے اور ان کی خوبیوں سے اخذ فیض کرتے اور اپنے فکر وخیال کو جامع سلجھے ہوئے اور پراعتماد انداز سے پیش کرتے۔

مولانا کو اپنے والد اور خاندان کے بعض قریبی عزیزوں کی قربت سے جو ادب وتاریخ سے خصوصی اشتغال رکھتے تھے، ادب وتاریخ کا اچھا ذوق حاصل ہوا تھا، اس کے اثر سے ادب میں اپنی زبان اردو کے علاوہ عربی زبان وادب میں خصوصی صلاحیت کے حامل بنے، اسی کے ساتھ قرآن مجید کی بلاغت اور اس کے مضامین کی قوت وتاثیر سے گہرے استفادہ کا موقع ملا، اور اس میں ان کو خصوصی صلاحیت حاصل ہوئی، جو ان کی دعوتی واصلاحی تحریروں وتقریروں میں پائی جاتی ہے تاریخی حالات کے دائرہ میں انہوں نے ہندوستان اور بلاد عربیہ کے علمی وسیاسی نشیب وفراز اور دینی وتمدنی عروج وزوال کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا، اس کے ساتھ مغربی ممالک کی سیاسی

وتمدنی تاریخ کا بھی ناقدانہ مطالعہ کیا۔

مولانا کا تاریخ اسلام کا مطالعہ صرف سادہ نہ تھا؛ بلکہ تاریخ کے واقعات کے فکری اور دعوتی پہلوؤں کا گہری فہم کے ساتھ استفادہ تھا، اور یہ اس کی اہم شخصیات کے تعمیری اور عملی کارکردگی کے پہلوؤں پر مخصوص نظر ڈالنے کے ساتھ تھا، اسی کے مطابق اہم شخصیات کو اپنی تصنیفات میں پیش کیا اور صرف ان کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ خود اپنے لیے ان کی عملی سوغات حاصل کی، لہٰذا مولانا کی زندگی کی کارگزاریوں میں ان کے اثرات واضح ملتے ہیں، مولانا کے تاریخی مطالعہ میں فکر اسلامی کے اثرات ملتے ہیں، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کے فکر ممتاز پہلو مولانا کو پسند تھے، ان کا اثر مولانا کے فکری مطالعہ میں محسوس کیے جاسکتے ہیں اور تاریخ اسلامی کے مجددین میں اپنے اپنے وقت کے فتنوں کے مقابلہ کے لیے جو ذرائع مولانا نے دیکھے ان کا اثر لیا، مجدد الف ثانیؒ کے یہاں سے حکمرانوں کو مخلصانہ نصیحت اور حکیمانہ دعوت کے انداز کو پسند کیا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے یہاں سے علمی فکرمندی کی پوری قدردانی کی اور فائدہ اٹھایا جو مولانا کی ''ارکان اربعہ'' میں محسوس کیا جاسکتا ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی کارگزاری ارشاد و جہاد کو مولانا نے بہت قدردانی کی نظر سے دیکھا، جو ان کی ''سیرت سید احمد شہید'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ دعوتی کاموں میں مخاطب کے جذبہ وعقیدہ کو پیش نظر رکھتے تھے جو افراد فکر و عقیدہ کے لحاظ سے ارادتاً دین کو نقصان پہونچانے والے ہوتے تو ان پر وہ پرزور طریقہ سے تنقید کرتے، چنانچہ عرب دنیا میں جو فوجی انقلابات ہوئے ان کے سربراہوں پر کھلے طریقہ سے تنقید کی، لیکن جن کے یہاں یہ بات بنیادی و یقینی نہیں دیکھی، ان کے لیے کھلے عام نہیں بلکہ نجی ملاقاتوں کے ذریعہ یا اخفاء کے ساتھ خطوط لکھ کر ان تک اصلاح کی بات پہونچائی، جیسے ملک فیصل، ملک فہد، ملک مراکش، اور ملک حسین کے سلسلہ میں ان کا یہ طرز عمل رہا، اور کھلی تنقید میں جمال عبدالناصر، ترکی کا مصطفیٰ کمال اتاترک اور اس طرح کی دیگر شخصیات کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

نصیحت اور دعوت کے سلسلہ میں مولانا کا رویہ اس آیت سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، جس میں اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

ان کے پیش نظر یہ بھی رہا ہوگا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے نصیحت کرنے میں رعایت کا حکم دیا، لیکن وہ لوگ جو جری تھے اور فطری طور پر مخالفت اسلام پر بضد تھے ان کے لیے صاف صاف حکم ہے:

﴿قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾

مولانا کا دعوت کے سلسلہ میں عام رویہ اس جامعیت کا بھی تھا کہ خواص کے لیے بطریق مذکور حسب لیاقت خواص والا طریقہ اختیار کرتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، عوام میں تو ان کی عوامی سطح کے لحاظ سے صراحت سے بات کہتے، اس میں مخاطب کے نام کو معین کر کے بات نہ کہتے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس طرح کی وضاحت ملتی ہے:

"ما بال اقوام يفعلون كذا و كذا"

ان مختلف اور متعدد فائدوں کو مولانا کی خود علمی و دعوتی کاوشوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اسی طرح مولانا نے امام غزالیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی فکرمندی اور کاوشوں کو محسوس کیا اور مولانا میں اس سلسلہ میں احسان وسلوک اور ارشاد کا جذبہ ابھرا، اور انہوں نے اپنے زمانہ کے مرشدین سے رابطہ قائم کیا اور فائدہ اٹھایا، خاص طور سے مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کا اثر زیادہ لیا، نیز ان کا اعتماد حاصل کیا، مولانا میں اس کا رجحان یوں بھی پیدا ہوا تھا کہ ان کے نانا اپنے عہد کے بڑے بزرگ تھے اور خاندان حسنیہ میں سید احمد شہید کے اثرات بھی تھے۔

تعلیمی موضوع پر مولانا کا یورپ کی ترقیات کا مطالعہ بھی گہرا تھا، انہوں نے تعلیم کا ترقی یافتہ انسان کی تشکیل میں گہرا اثر دیکھا، لہٰذا مولانا نے ندوۃ العلماء کی تعلیمی فکر کو بہت

پسند کیا اور اس کے ناظم خود مولانا کے والد اور بھائی رہے تھے، لہذا اس کو واضح طریقہ سے سمجھا تھا، اور اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، چنانچہ ندوہ نے ان کی سرپرستی میں خصوصی ترقی کی اور اس میں مختلف ضروری شعبے قائم ہوئے اور تعلیم کے متعدد پہلوؤں کا اضافہ ہوا۔

ان تمام مذکورہ بالا اثرات سے مولانا کی عملی زندگی میں خصوصی رنگ پیدا ہوا تھا، جو ان کی فکری، تعلیمی، دعوتی و باطنی خصوصیات میں واضح انداز سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے معاشرہ میں وقتاً فوقتاً عروج و زوال کے جو حالات پیش آئے اور من حیث القوم جن شخصیات نے اصلاح حال کا جو کام انجام دیا اور جس نے معاشرہ پر گہرا اثر ڈالا، مولانا نے اس کا علمی جائزہ لیا اور اس سلسلہ میں خاص طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید کی اثر انگیزی اور کوششوں کے نتائج سے واقفیت حاصل کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ان کی حسن کارکردگی اور مجددانہ سطح کو سمجھا اور فکری طور پر اس سے بہت متاثر ہوئے، خاص طور پر بگڑے ہوئے اور خطرناک دور کے حالات میں مجدد الف ثانیؒ کی جو حکمت عملی تھی اس کو بہت زیادہ کارگر محسوس کیا اور اپنے عہد کی مغربی یلغار اور الحادی اثرات میں مجدد صاحبؒ کے طریقۂ عمل کو لائق ترجیح پایا اور اسی کو دعوت کے لیے اور حکومت وقت کی اصلاح کے لیے موزوں سمجھا، حضرت سید احمد شہیدؒ نے اصلاح و تربیت اور جہاد کے سلسلہ میں جو کارنامہ انجام دیا جو ان کی عزیمت اور اتباع سنت کی مثال تھا اور عہد نبوت کے تدریجی طریقہ کے تابع تھا، اس میں مکی اور مدنی زندگی دونوں کی اتباع ملتی ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے رفقاء کی اصلاح باطن سے کام کا آغاز کیا، شدت وانتقام سے گریز کیا اور اپنے علاقے میں شیعیت کے اقتدار کو مضر سمجھتے تھے، لیکن اس سے براہ راست ٹکرانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اولاً دعوت و تربیت کے مرحلہ کو انجام دیا اور اس کے بہترین نتائج سامنے آئے، اس کی روشنی میں سیرت نبوی کے اگلے مرحلوں کی پیروی کرتے ہوئے جہاد کے مرحلہ تک پہنچے اور یہ جہاد بھی سیرت نبوی کی ممکنہ اتباع کے جذبہ سے کیا، چنانچہ اس کے لیے اپنے غیر اثر علاقہ سے نکل کر آزاد اور مسلم

علاقے میں جا کر مرکز بنایا اور وہاں سے عمل جہاد کو کفار کے مقابلے میں اختیار کیا، مسلم اقتدار سے نبرد آزمائی میں احتیاط کی، ان سے قبل کے عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے ملحدانہ رویہ کا مقابلہ حکیمانہ، تدریجی اور نجی انداز سے دعوت و اصلاح کے ذریعہ صبر و انتظار کے ساتھ کر چکے تھے۔

ان دو مثالوں سے حضرت مولاناؒ نے اپنے دور کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے نمونہ حاصل کیا اور اصحاب اقتدار سے ناصحانہ انداز سے بات کرنے اور متوجہ کرنے کو اختیار کیا اور خطابت کا موقع یا تحریری طریقہ اختیار کرنا پڑا تو مخاطبین میں اگر کچھ خوبیاں بھی ہیں تو ان کا تذکرہ مقدم کیا، پھر ناصحانہ انداز میں خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، اس طریقۂ کار کا یہ اثر ہوا کہ ان کی مخاطبت کو ناصحانہ انداز کی ہونے کے سبب معاندانہ یا مخالفانہ نہیں سمجھا گیا؛ بلکہ نصیحت کو دوستانہ سمجھتے ہوئے سنا گیا اور فائدہ سے خالی نہیں ہوا۔

اس سلسلہ میں مولانا کا طریقہ یہ رہا کہ اصحاب اقتدار کی پالیسی کا جائزہ لے کر ان کی کمزوریوں اور مضرتوں سے خود اصحاب اقتدار کو آگاہ کرنے کے لیے سربراہان اقتدار سے ملاقات کر کے واقف کراتے اور یہ ایسے اسلوب و زبان کے ذریعہ کہ وہ اس توجہ دہانی کو مخلصانہ سمجھتے اور اس طرح ان کی بات ناصحانہ سمجھی جانے پر اثر رکھتی، دینی و ملی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ بھی مولانا کا اس طرح کا معاملہ تھا، مولانا ان کے اچھے کاموں کی قدردانی کرتے اور حسب موقع ان میں عملی شرکت کرتے اور جہاں مشورہ دینے کی ضرورت سمجھتے مشورہ بھی دیتے؛ لیکن اس کا انداز مخالفانہ نہ ہوتا؛ بلکہ ناصحانہ ہوتا، جماعت اسلامی کے ساتھ، تبلیغی جماعت کے ساتھ، نیز اہم دینی و ملی جماعتوں کے ذمہ داروں کو بھی ان کی پوری قدردانی کے ساتھ حسب ضرورت مخلصانہ مشورہ دیتے، مولانا کی نظر میں دعوتی کام ملت کا زیادہ اہم کام تھا، وہ دعوتی کام کے ساتھ سیاست کے مروجہ طریقہ کار کو خلط ملط کرنے کو مضر سمجھتے تھے اور اختلافی امور میں غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتے، چنانچہ وہ جن جماعتوں میں شرکت کی وہ سب متحدہ نوعیت کی تھیں، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا ساتھ دیا، آل انڈیا مسلم

پرسنل لا بورڈ میں ذمہ داری کی سطح پر شریک رہے، ندوۃ العلماء کو بھی اختلافی معاملات سے غیر جانب دار رکھا، اپنی اس مذکورہ احتیاط کے ساتھ نصیحت وتوجہ دہانی بھی مثبت طریقہ سے کرتے تھے، مصر میں اخوان المسلمین کے قائدین سے ملاقات پر ان کے اچھے پروگراموں اور کاموں کی قدردانی کرتے ہوئے ان کو ان کی دعوتی کاوشوں کو دعوتی دائرے کے ساتھ مخصوص رکھنے کا مشورہ دیا جس کو جماعت کے قائدین نے سراہا، لیکن وہاں کے حالات نے ان کے قائدین کو زیادہ دن تک اس پر نہیں رہنے دیا، مولانا کا خیال تھا کہ دعوت اور طریقہ سیاست عموماً دونوں کا عمل علاحدہ علاحدہ ہونا مناسب ہے، مولانا سیاست کی پوری سمجھ رکھتے تھے اور نجی سطح پر اس کے بارے میں رائے بھی دیتے تھے، لیکن عملی انداز میں سیاست میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے اور اس کو دعوتی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں سمجھتے تھے، مولانا دعوتی کوششوں کے ضمن میں مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ اور مخلوط معاشرہ میں پیام انسانیت کے عنوان سے اصلاحی کوششوں کو اپنانے کی تلقین کرتے تھے اور اس میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔

مولانا اپنے ملک ہندوستان کے حالات کو بڑی فکرمندی اور تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی بناء پر کن خطرات سے دوچار ہو سکتے ہیں نیز مسلمانوں کو بحیثیت ایک عظیم ملت کی حیثیت سے کیا کردار انجام دینا چاہئے، مولانا نے اس کی طرف مسلمانوں کو بہت توجہ دلائی اور تاریخ کی مثالوں کی طرف متوجہ کیا اس سلسلہ کی ان کی توجہ دہانی کے طور پر ان کی تقریر کا یہ حصہ ایک مثال ہے:

> ''دیکھئے اس وقت ہندوستان میں ایک ایسا دور آیا ہے جو ہمارے علم میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، دور اکبری سے تو کسی قدر مشابہت ہے لیکن دور اکبری بھی اس درجہ میں اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا یہ دور جواب چل رہا ہے؛
>
> وہ یہ کہ اس وقت اکثریت نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس ملک میں اگر مسلمان رہیں، تو اپنی تمام ملی تشخصات کو چھوڑ کر رہیں، اذانیں بھی زور

سے نہ ہوں، اس طرح مسجدوں کا وجود بھی خطرہ میں ہے، بابری مسجد کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس نے اس کا راستہ کھول دیا ہے، اور اب ہندو اخبار نویس ہندو کالم نگار اور ان کے سوچنے سمجھنے والے کھلے عام لکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں ہندو بن کر رہنا ہوگا، یہاں مسلمان بن کر رہنے کی گنجائش نہیں ہوگی، وہ لباس میں صورت وشکل میں زبان میں رسم الخط میں تہذیب وثقافت میں ان تمام امتیازی خصوصیات سے دستبردار ہو جائیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ مسلمان ہیں۔

اس وقت اس فتنہ کو روکنے کی سب سے بڑی طاقت جو ہو سکتی ہے وہ علماء کی طاقت ہو سکتی ہے وہ ہمارے فضلائے مدارس کی ہو سکتی ہے، وہ جہاں کے بھی رہنے والے ہوں وہاں کی مسجدوں میں تقریر کریں اسی طرح جمعہ وعیدین میں اور دوسری تقریبات کے موقع پر تقریر کریں، خوشیوں کے موقع پر تقریر کریں، کہ ہم کو اپنے پورے ملی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہنا ہے کسی ایک چیز کو نہیں چھوڑنا ہے ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں کہ ہمارا پائنچہ ٹخنے سے نیچے ہو ہم اس کے لیے بھی تیا رنہیں کہ ہماری ڈاڑھی میں کمی ہو، ہم بالکل شریعت پر عمل کریں گے اور شریعت کے ساتھ رہیں گے اور ہمارا اپنا نظام تعلیم رہے گا، اپنے بچوں کو توحید کی تعلیم دیں گے دینیات پڑھائیں گے اردو رسم الخط کو زندہ رکھیں گے، یہ سب سے بڑی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اور آپ ہی سب سے بہتر اس ذمہ داری کو ادا کر سکتے ہیں۔

اس بات کو لکھ لیجئے کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ متحدہ کلچر، اور ملی تشخص سے دست بردار ہونا ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی وعلمی حلقہ کے بعض لوگ بھی جو قلم کا استعمال جانتے ہیں اور علمی زبان بولتے ہیں وہ بھی اس کی دعوت دینے لگے ہیں کہ

مسلمانوں کو کسی بات پر اصرار نہیں کرنا چاہئے، پرسنل لا کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جو اصرار کیا گیا یہ بھی مسلمانوں کی غلطی ہے، اس سے ہندوؤں میں ایک ردعمل پیدا ہوا اور وہ سمجھے کہ مسلمان تنگ نظر ہیں، نہیں!! ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم یہاں اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ رہیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ملک کی قیادت نصیب فرمائے گا، اس لیے کہ اس ملک کی آبادی کے کسی عنصر نے اپنے کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ اس ملک کو خطرہ سے بچائے، سب دولت پرست ہیں، مادہ پرست ہیں، نفس پرست ہیں، طاقت پرست ہیں، اقتدار پرست ہیں، جاہ پرست ہیں، اس لیے ہم عزت کے ساتھ رہیں گے اپنے تشخصات کے ساتھ رہیں گے سر اونچا کر کے چلیں گے، ہماری نگاہیں بلند ہوں گی، اور ہم سمجھیں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں صحیح ہے اور ہندوستان کا دستور ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے اور ہندوستان اسی حالت میں صحیح سلامت، مامون ومحفوظ اور خوشحال رہ سکتا ہے جب ایک دوسرے کو آزادی کے ساتھ جینے کا حق دیا جائے، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور مذہبی شعائر کا مظاہرہ کر سکیں اور ملی تشخص کو برقرار رکھیں۔

موجودہ حالات میں ہمیں مایوس اور شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں، اس حقیقت کو ہم پیش نظر رکھیں کہ اسلام اس ملک میں یوں ہی نہیں آیا بلکہ تقدیر الٰہی کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اس ملک میں اسلام کو بھیجا گیا ہے، اللہ نے اپنی رحمت، تائید اور اپنی نصرت کے ساتھ اس کو بھیجا ہے، یہ دین یہاں سے ختم نہیں ہوگا۔''

حضرت مولاناؒ کی امتیازی شخصیت کے کئی پہلو تھے، شخصی دائرہ میں وہ متواضع کسر

نفسی کی خصوصیت، دینی حمیت اور صلاح وتقوی کے حامل تھے، اجتماعی دائرہ میں بااخلاق اور دوسروں کی امتیازی خصوصیت کو تسلیم کرنے والے اور ان کی رائے کو اس کا حق دینے والے تھے، اسی کے ساتھ ملت کے معاملات کو ان کے پس منظر میں رکھ کر رائے قائم کرنے والے اور ممالک اسلامیہ میں قائم نظاموں اور وہاں جو انقلاب آئے، ان انقلابوں کے پس پشت جو عوامل واسباب انقلاب کرنے والوں کے تھے اس کے اصل مقاصد کی حقیقت تک پہونچنے کی خصوصیت کے حامل تھے، چنانچہ مصر میں انقلاب کرنے والے اشخاص کو اور پھر لیبیا، عراق، شام اور ایران میں ہونے والے انقلابوں کی صحیح صورتحال کا اندازہ حضرت مولاناؒ نے شروع ہی میں کرلیا تھا، شروع میں مولاناؒ کے اندازہ کو لوگوں نے قابل قبول نہیں سمجھا تھا، لیکن بعد میں ان کے اندازہ کی پوری طرح تصدیق ہوئی اور اس پورے علاقے میں جہاں جہاں دینی نعرہ کے ساتھ انقلابی کوشش ہوئی یا تو ناکام ہوئی، یا شروع میں اچھے وعدے بعد میں اس کے برعکس صورت حال سامنے آئی، دراصل اکثر حکمراں باہری طاقتوں کے تحت اپنی پالیسی بناتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ پر دعوت کے کام کو اہمیت دینے کا بڑا غلبہ تھا، اس سلسلہ میں ان کا انداز حکیمانہ ہوتا تھا، جو انہوں نے قرآن مجید کی رہنمائی سے حاصل کیا تھا، وہ ذمہ داران حکومت سے ملتے اور بلند سطح سے ملتے، اس میں مرعوبیت کا اثر نہیں ہوتا تھا، وہ دولت مندوں اور حکمرانوں سے مادّی مدد لینے یا شخصی فائدہ اٹھانے سے پورا گریز کرتے تھے، ان سے ہدیہ لینے سے بھی معذرت کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہم شخصی فائدہ اٹھائیں گے تو ان کو غلطیوں پر ٹوکنے کا اثر باقی نہیں رہے گا، مولاناؒ کے اس استغنائی عمل سے ان کا وقار بااثر شخصیات کے دلوں پر قائم ہوتا تھا کہ یہ بے غرض عالم دین ہیں اور یہ خیر خواہی کی صفت کے حامل ہیں۔

خود میرا ان کا ساتھ کئی اہم سفروں میں رہا، میں نے ان کو بعض بادشاہوں سے بات کرتے دیکھا اور کڑوی نصیحت خوبصورت غلاف میں پیش کرتے پایا، بعض وزرائے اعظموں کو نصیحت کرتے دیکھا کہ تلخ بات پر بھی ان کے مخاطب کو ہاں اور جی

ہاں کہتے پایا، اور بعض رہنماؤں سے بات کرتے ہوئے میں نے یہ طرز دیکھا کہ خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ کڑوی نصیحت بھی سنادی گئی جس کو مخاطبین نے برداشت کیا، ایسی متعدد مثالیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، مولاناؒ کے اس طرز کا میں نے بڑا فائدہ اور خاصا اثر دیکھا۔

میں نے مولانا کو شاہ فیصل شہیدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا، شاہ فہدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا اور شاہ مراکشؒ سے بھی مخاطب ہو کر بات کرتے دیکھا اور ہندوستان کے کئی وزرائے اعظموں سے بات کرتے دیکھا، خوشامد سے خالی، لیکن خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ توجہ دہانی، موثر اور ناصحانہ انداز میں بات کرتے دیکھا، شاہ بانو نان نفقہ کیس میں جو کامیابی ملی، اس میں مولانا کی اس حکمت عملی کا بھی دخل رہا، بابری مسجد کے سلسلہ میں راجیو گاندی کو مسئلہ کے حل کے لیے بروقت متوجہ کر کے مسجد کو محفوظ رکھنے پر زور ڈالتے دیکھا، ملی معاملات میں تنہا فیصلہ کرنے کے بجائے ملک کی مقتدر سیاسی شخصیات اور مذہبی رہنماؤں سے رابطہ قائم رکھتے اور اپنے کسی موقف پر اڑنے کے بجائے مشاورتی طریقہ کو ترجیح دیتے اور اپنے رفقاء کی رائے کو فیصلہ لینے میں پورا اختیار دیتے تھے۔

گفتگو اور تقریر میں مولانا کی بات اثر انداز اسلوب میں ہوتی تھی جس کے ذریعہ وہ مفید اور توجہ دہانی کا کام لیتے تھے، عربی زبان بھی نہایت فصاحت سے استعمال کرتے تھے، بات کو نہایت سلیقہ سے پیش کرتے تھے، مولانا کا تصنیفی کام بھی نہایت موثر تھا، ان کی کتابوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، پڑھنے والوں نے ان کو بہت سراہا اور ان میں مولانا کے مدلل اسلوب اور دعوتی انداز کو بہت پسند کیا اور اس سلسلہ میں ابھی کم عمری ہی تھی، برصغیر کی دعوت وعمل جہاد کی عظیم القدر تحریک کو موثر انداز میں اپنی علمی تصنیف ''سیرت سید احمد شہید'' کی صورت میں پیش کی جس کو برصغیر کے اہل علم نے بہت قدر واثر سے دیکھا اور مولانا کی اس کاوش کو بہت سراہا، اس کے بعد مولانا نے ایک بہت اہم کتاب " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) بلیغ عربی میں پیش کی،

یہ بہت مقبول ہوئی اور پورے عالم اسلام میں پڑھے لکھے طبقوں میں بہت قدر کے ساتھ پڑھی گئی اور اس کی اہمیت کا تذکرہ پڑھنے والوں کی زبان سے سنا گیا، اس میں اسلام اور مسلمانوں کے ظہور وعروج، پھر زوال وانحطاط کا مدلل جائزہ پیش کیا گیا، اس کے ساتھ مولانا کی دیگر اہم کتابوں میں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' نامی کتاب سامنے آئی جس نے اسلامی تاریخ کے مجددانہ کارناموں کی تاریخ پیش کردی، اس کو پڑھ کر دین وملت کے داعیوں کو مفید مواد حاصل ہوتا ہے، اسی طرح موجودہ مسلمان حکومتوں پر مغربیت کے جو مضر اثرات ہیں، اس کا جائزہ مدلل طریقہ سے پیش کیا، جو ''مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' نامی کتاب میں ہے، اس کے علاوہ مولانا ؒ کی تقریروں کے مجموعے اور ان کے اصلاحی خطبات بہت اثر رکھتے ہیں اور ان کی متعدد علمی سطح کی کتابوں نے مقبولیت حاصل کی، مولاناؒ کی عربی تقریر بھی بہت موثر ہوتی تھی، بالکل اہل عرب کی طرح تقریر کرتے، جس کا اقرار عرب علماء نے بھی کیا۔

مولانا کا یہ مزاج اپنے عہد کی شخصیتوں میں بہت کارگر اور مفید اثر ڈالتا تھا اور اس طرز عمل نے مولانا کو اپنے عہد میں منفرد شخصیت کا حامل بنادیا تھا، اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے عہد کے بادشاہوں اور حکومتی سربراہوں سے اصلاح ودرستگی کی ضرورت کی طرف بہت پر اعتماد اور خیر خواہانہ انداز سے گفتگو اور نصیحت کا طریقہ اختیار کیا اور ان سے مادی فائدہ اٹھانے سے پورا پرہیز کیا، تاکہ استغنا کے ساتھ بات میں جو اثر ہوتا ہے وہ اثر پڑے اور اسی کا نتیجہ یہ رہا کہ مولانا کی نصیحتوں کو خیر خواہانہ انداز کا سمجھ کر اس عہد کے حکمرانوں نے ان نصیحتوں کو قدر کے جذبہ سے سنا اور کچھ نہ کچھ اثر لیا۔ حضرت مولاناؒ کی ناصحانہ گفتگو کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

> ''ایک جمہوری، آزاد وترقی یافتہ ملک میں اچھا یا برا کردار ملت کی حفاظت یا ملت کی ہلاکت کا پارٹ ''خواص'' کا وہ طبقہ ادا کرتا ہے جو مجالس قانون ساز، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اس ملت کا نمائندہ یا حکومت وانتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں اور منصوبوں پر فائز ہوتا

ہے، یا صحافت وسیاست میں اونچا مقام رکھتا ہے، یا ملک کے دانشوروں، اہل قلم اور مفکرین میں ان کا شمار ہوتا ہے، اسی طبقہ کا ایک ایک فرد ہزاروں، لاکھوں کے مقابلے میں زیادہ وزن واعتبار رکھتا ہے۔

اس طبقہ کی دینی حمیت وملی غیرت، اخلاقی جرأت، معمولی قربانیاں، صدیوں کے لیے ملت کا مستقبل محفوظ کر دیتی ہیں اور جو کام بعض اوقات لاکھوں کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے، وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام دے دیتی ہے، وہ اگر کسی ملی مسئلہ پر یک زبان و یک آواز ہو جائے اور ملت کے دین، اس کی تہذیب یا اس کی ثقافت اور کلچر یا اس کے قانون وشریعت کو بچانے، یا ملت کو باعزت بااصول رکھنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اقتدار کی کرسی اور جاہ واعزاز سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، ایوان ہائے قانون ساز کی رکنیت، صدارتیں اور قیادتیں، عہدے اور اس مقصد عزیز کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی نہ معلوم ہو، تو چشم زدن میں بڑے بڑے فیصلے بدل جائیں، ناممکن ممکن ہو جائے، خطرے کے پہاڑ اور چٹانیں ریت کے ذرات میں تبدیل ہو جائیں اور پوری ملت، عزت وتوقیر، شرف واعتبار سے ہمکنار ہو۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، ان کو ملت کے اجتماعی مفاد کے مقابلے میں اپنی کرسی عزیز ہوتی ہے اور اپنا مفاد مقدم، ان کو ادنی سے ادنی خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں ہوتی، یا حکومت واکثریت کی پیشانی پر ادنی سی شکن پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، وہ اپنے حقیر فائدے کے لیے ملت کے بڑے سے بڑے نقصان، اس کی تہذیب کا زوال اور اس کے ذہنی ودینی ارتداد تک گوارا کر لیتے ہیں اور ملت کے تمام مفادات، اس کی موت وحیات کے مسئلے سے آنکھیں بند

کر کے اپنے منصوبوں کی تکمیل، اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے محلوں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں اور کوئی بڑے سے بڑا واقعہ یا حوادث کا تازیانہ، ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی نہیں ہوتا، تو پھر اس ملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کے بڑے سے بڑے مخلص وناصح اور چارہ گر و مسیحا اس کے درد کی دوا نہیں کر سکتے''۔(۱)

مولانا اپنے اس طریقہ وطرز عمل کو زیادہ مفید سمجھتے تھے اور ان کو اس کے سلسلہ میں اچھے تجربات ہوئے کہ ان کی باتوں اور توجہ دہانیوں کو بڑی سے بڑی شخصیت نے توجہ سے سنا اور اظہار قدر دانی کیا اور اس کی بنا پر عمل پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا تھا، یہ طرز قرآنی ہدایت کے مطابق بھی ہے کہ:

﴿ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۲)

اس آیت میں مخاطب سے ناصحانہ اور اچھے انداز سے بات کرنے کا حکم ہے اور ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ تم اچھے انداز میں بات کرو گے تو تمہارا دشمن تمہارا دوست بن سکتا ہے اور تجربہ بھی بتاتا ہے کہ مشورہ اور نصیحت میں سخت کلامی سے معاملہ مزید خراب ہو جاتا ہے اور جس کی لاٹھی زیادہ بڑی ہوتی ہے وہ کامیاب ہوتا اور انتقام لیتا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلطی عموماً کی جاتی رہی ہے اور اس کے نتائج سنگین آتے رہے ہیں، مولانا نے اس غلطی کے نقصان کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:-

''مسلمانوں کی ایک عام کمزوری ضرورت سے زیادہ جذباتیت ہے، یہ کمزوری جہاں اور جب اجتماعی طور پر پائی جاتی ہے اور جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے، بڑے خطرات اور نقصانات کا موجب ہوتی ہے اور اس سے بعض غلط اندیش عناصر ناجائز فائدہ اٹھاتے

(۱) خطبات علی میاں، مرتبہ: مولانا محمد رمضان میاں صاحب، کراچی، جلد پنجم، ص: ۲۳۰

ہیں، بعض نادان دوست بھی سخت نقصان پہنچادیتے ہیں، تاریخ میں بڑے ملی حوادث ومصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال پذیری اور سرعت انفعال تھی، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے ؎

چواز قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را عزت ماند نہ مہ را

پھر اگر یہ ''بے دانشی'' ایک دو افراد کی طرف سے نہ ہو؛ بلکہ ایک بڑی جماعت یا عوام کی طرف سے ہو، تو وہ اور مہیب ورسوا کن اور دور رس نتائج کا سبب بن جاتی ہے، اسی حقیقت کو مشہور عرب شاعر متنبّی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

وجرم جرّہ سفہاء قوم
فحل بغیر جارمہ العقاب

(وہ غلطی جس کا ارتکاب کسی قوم کے خفیف العقل لوگوں نے کیا اس کے نتیجہ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے اور ناکردہ گناہ لوگوں کو بھی اس کی سزا بھگتنی پڑی)

جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں یا تاریخ میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں، انہوں نے دین حق کا دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم وبردبار، متحمل وعالی ظرف اور اسی کے ساتھ بہادر وغیور واقع ہوئی تھیں اور صدر اول کے مسلمان تو اس کا بہترین نمونہ ہیں۔ ''Highly Inflammable'' (جلد اور بہت زیادہ آگ پکڑنے والی چیز) یہ پٹرول کی تعریف ہوسکتی ہے، بارود کی تعریف ہوسکتی ہے، کسی آتش گیر مادہ کی ہوسکتی ہے، مسلمان کی تعریف نہیں کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھے اور عواقب ونتائج سے بے پرواہ ہوکر جو

چاہیں کر گزریں، عمل وردعمل میں کوئی تناسب نہ ہو، رائی کا پربت بنادیں اور دوست دشمن، خطاوار وغیر خطاوار، کمزور وطاقتور، بچوں بوڑھوں کی کسی کی تمیز نہ ہو، یہ جذباتیت اور سریع الانفعالی ایک خطرناک بیماری ہے جس کے علاج کی فوری ضرورت ہے اور ہمارے قائدین اور داعیان دین اور تعلیم وتربیت واصلاح وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس کی طرف فوراً توجہ کرنا چاہئے''۔(۱)

حضرت مولانا کا یہ تبصرہ سرسری انداز کا تبصرہ نہیں تھا؛ بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے وہ اس رائے پر پہنچے تھے اور وہ اس سلسلہ میں حضرت احمد سرہندیؒ کے طریقۂ کار کی مثال دیتے تھے اور خود انہوں نے اپنے عمل کے لیے مثال بنایا کہ اسلام اور مسلمانوں کے عزت وذلت کے مسائل میں بہت مضبوط اور دل وجان سے لگ جانے والے تاثر وکوشش کو اختیار کرتے ہوئے حکمت وحسن تدبیر کو اپنایا، ان کی فکرمندی وشدت تاثر کو دیکھتے ہوئے ان کے متعلق پرجوش طریقہ کو اختیار کرنے کی رائے متعدد لوگوں کی ہوئی، لیکن ان کے متعلق یہ رائے صحیح نہیں، ان کا عمل ان کے طریقۂ کار میں حکمت وحسن تدبیر کا ہی ملتا ہے، میں ان کی کئی سربراہان مملکت سے ملاقاتوں میں جن میں میں موجود رہا، میں نے یہی دیکھا کہ ان کی حکومت وسیاست کی خامیوں کا بہت صحیح اندازہ کر کے ان سے ملاقات پر واضح طریقہ سے ان کو متوجہ کیا؛ لیکن بات کرنے کا انداز حکمت وحسن کلام کا رہا، ان کی صحیح باتوں کا اعتراف وتحسین کرتے ہوئے قابل مذمت معاملوں کو واضح طریقہ سے قابل تبدیل قرار دیا، چنانچہ ان کی گفتگو سے ان کو ناراضگی نہیں ہوئی؛ بلکہ انہوں نے اپنے عمل کی توجیہ ووضاحت کو اختیار کیا، اور میں نے دیکھا ہے کہ مولانا نے صراحت سے ان کے نقائص کی بات کی، لیکن ایسے انداز میں کی کہ ان کو مولانا کی بات میں خیرخواہی کا جذبہ محسوس ہوا، اسی کے ساتھ مولانا کا یہ عمل بھی رہا کہ ان لوگوں کے نقص کو نجی طریقہ سے کہنے کو ترجیح دیتے، اخبارات میں اس کو پروپیگنڈہ کا ذریعہ نہیں

(۱) خطبات علی میاں، جلد پنجم، صفحہ: ۲۱۰

بناتے تھے اور کھلے عام ان پر تنقید کے سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ اس کا فائدہ ہوتا تھا اور شاہ بانو کے معاملہ میں وزیر اعظم کا پارلیمنٹ سے قانون منظور کرانا اسی طریقہ کا فائدہ تھا، اٹل بہاری باجپئی کے وزیر اعظم ہونے کے زمانہ میں باجپئی مولانا سے ملے اور مولانا نے ان کو اسی انداز میں نصیحت کی اور اس کا فائدہ بھی ہوا کہ بی جے پی کے نمائندہ ہونے کے باوجود نیم سیکولر انداز کے وزیر اعظم رہے۔

بابری مسجد کے سلسلہ میں مولانا کی کوششوں سے ہندو مذہبی رہنما نے مسجد کو بحال کرنے کی ایک تدبیر کا وعدہ کیا، لیکن اس سلسلہ کے دیگر رفقاء کار نے اس کو ناکافی قرار دے کر قابل قبول نہیں قرار دیا، بعد میں حکومت نے مسجد کو آثار قدیمہ میں لینے کا منصوبہ جاری کیا اس کو بھی رفقائے مسئلہ نے کافی قرار نہیں دیا، اس طرح مسئلہ وہاں تک پہنچا کہ دشواری بڑھی۔

مولانا سربراہان حکومت سے نرم و ناصحانہ انداز اختیار کرنے کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام رکھتے تھے کہ ان سے کسی طرح کا مالی یا دنیاوی فائدہ نہیں اٹھاتے، ان کے جائز ہدیے بھی قبول نہیں کرتے، سعودی عرب کی دو اہم کمیٹیوں کے ممبر تھے اور ممبروں کو شرکت پر کرایہ کے علاوہ الاؤنس بھی ملتا تھا، مولانا کرایہ تک اکتفا کرتے، الاؤنس نہیں لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس طرح کا کوئی فائدہ اٹھائینگے تو کڑوی بات ان سے نہ کہہ سکیں گے حتی کہ ندوہ کے ناظم ہونے کی ذمہ داری کے تقاضہ سے ندوہ کی مالی اعانت کی اپیل بھی نہیں کرتے تھے، یہ کام ان کے معاونین کے ذریعہ انجام دیا جاتا رہا۔

مولانا کی شخصیت آج بھی قابل نمونہ ہے، اور جن خطرات کی نشاندہی مولانا نے کی تھی، وہ مزید ابھر کر سامنے آگئے ہیں، ان کے دعوتی و اصلاحی طریقۂ کار کو اختیار کرنا موجودہ حالات میں بہت سودمند ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

منہج فکر و دعوت

جامعیت واعتدال

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہشت پہل کہی جاتی ہے، نہ جانے ان کی شخصیت کے کتنے پہلو ہیں جن پر روشنی ڈالی جا چکی اور کتنے پہلو ہیں جو ابھی تک پوری طرح سامنے نہ آسکے، لیکن ان تمام پہلوؤں میں جو پہلو سب سے نمایاں ہے وہ جامعیت کے ساتھ ان کا وہ اعتدال ہے جو ان کو مفکرین و مصلحین کی صف میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

مولانا کی وفات کو اب دوسری دہائی بیت رہی ہے، لیکن امت اسلامیہ ان کے درد کی کسک آج بھی محسوس کر رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آج کے پُر آشوب دور میں ان کی متوازن فکر کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔

مولانا نے کسی شجر کو ممنوعہ نہیں سمجھا لیکن وہی پھل پھول لیے جو امت اسلامیہ کے لیے قوت وحیات کا ذریعہ ہوں:

"الحکمة ضالة المؤمن حیث ما وجدها فهو أحق بها"

(حکمت مؤمن کا گمشدہ مال ہے جہاں اس کو پالے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے)

یہ اصول ہمیشہ مولانا کے پیش نظر رہا۔

حضرت مولانا نے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جو ایک دینی و علمی گھرانہ تھا، والدہ ماجدہ ایک رابعہ بصریہ صفت خاتون تھیں، مولانا کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جو خالص علمی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ باہر کی دنیا سے بھی باخبر تھا، برادر بزرگ و مربی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی ذات قدیم صالح اور جدید نافع کا بہترین سنگم تھی، ندوہ سے فراغت ہوئی پھر مولانا نے لاہور اور دیوبند کا سفر کیا، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ کیا، کچھ وقت مولانا ابوالاعلی مودودیؒ کی رفاقت میں بھی گذرا، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کی شخصیات وہ ہیں جنہوں نے زندگی پر گہرا نقش چھوڑا، علامہ اقبال کے اشعار ان کے خوابوں کی حسین تعبیر تھے، لیکن مولانا کے دل کی آواز یہ تھی:

میں نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

مولانا نے دعوت فکر و عمل کے لیے ایسا حسین گلدستہ تیار کیا جس میں رنگ رنگ کے پھول ہیں اور امتزاج ایسا حسین کہ ہر دیکھنے والے کے دل کو موہ لے، خوشبو ایسی کہ مشام جان کو معطر کر دے۔

والد کے صلاح و تقوی اور اخلاص نے ہموار زمین فراہم کی، والدہ کی دعائے نیم شبی اور دینی تربیت نے اصلاح باطن کا بیج دل میں ڈالا، بھائی کی جامعیت و اعتدال نے عقل و فکر پر اولین نقش قائم کیا، پھر اساتذۂ علم و فن نے جن میں متعدد وہ تھے جو اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں شمار کیے جانے کے لائق تھے ان ابتدائی نقوش کو گہرا کیا، حضرت مولانا احمد علیؒ، حضرت مولانا الیاسؒ اور حضرت رائے پوریؒ و شیخ

الحدیثؒ کی صحبتوں نے ان میں نیا رنگ بھر دیا، اصحاب عقل وفکر کی صحبت سے غور وفکر کے لیے نئے نئے راستے ملے، پھر مطالعہ کی کثرت اور گہرائی نے دعوت وفکر کی ایسی راہیں کھولیں جس نے ہزاروں بندگان خدا کو صحیح سمت دی۔

حضرت مولانا نے عقل ودل کو جس طرح جمع کیا ہے اور دونوں کو ایک ساتھ غذا پہنچائی ہے، یہ ایک نادر مثال ہے، عام طور پر اہل فکر دل کی طرف توجہ نہیں دے پاتے اور دلوں کی زمین پر محنت کرنے والے دنیا سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں، معروف عالم و فقیہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حضرت مولانا کی اس خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب تزکیہ نفس کے ضروری امر پر توجہ دیتا ہے جسے عرف عام میں تصوف وسلوک کہا جاتا ہے تو وہ کسی گوشے میں جا بیٹھتا ہے، اور اس کا دعوت وارشاد کا کام ایک خاص حلقے تک محدود رہتا ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصوف وطریقت کا بھی امام بنایا تھا، یہ ممکن تھا کہ حضرت مولاناؒ عالم اسلام کے سلگتے ہوئے مسائل سے چشم پوشی فرمالیتے، لیکن مولانا نے یہ انداز اختیار نہیں فرمایا، ان کے دل میں امت مسلمہ کا درد موجزن تھا، ان کے دل میں ایک ایسی آگ سلگی ہوئی تھی جو انہیں یہ سوچنے اور اس بات پر غور کرنے پر مجبور کرتی کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی صلاح وفلاح کا کیا راستہ ہوسکتا ہے؟ اس فکر اور جامعیت کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولاناؒ امت کے اجتماعی مسائل کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے تھے، اور پیری مریدی کا جو عام تصور ہے، ان کا عملی میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔''

حضرت مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے کبھی وسائل کو مقاصد

نہیں بنایا، مولانا اس کو امت میں اتحاد کا بڑا ذریعہ سمجھتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ منزل ایک ہے، دین کی خدمت، اعلاء کلمۃ اللہ، اللہ کی رضا کا حصول، اس کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، ان میں کسی ایک طریقہ پر زور دینا اور اس کو مقصد بنالینا امت میں تفریق کا سبب بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و دعوت کا بڑا سلیقہ عطا فرمایا تھا، وہ پوری جرأت کے ساتھ حق بات کہتے لیکن حکمت و موعظت کا اس میں ایسا سبق ہوتا جو مخاطب کے دل تک پہنچتا، کاخ فقیری سے لے کر ایوان شاہی تک سب ان کے مخاطب تھے، اور انہوں نے سب کا دل جیتا، اس کا بڑا سبب دنیا کے ہر طرح کے جاہ و حشم اور مال و زر سے مولانا کا وہ زہد تھا جس کو سب محسوس کرتے تھے۔

قومیت عربیہ کے فتنہ کا مولانا نے تعاقب کیا اور جمال عبد الناصر پر سخت تنقیدیں کیں اور اس سے پہلے کمال اتاترک کے فتنہ کو بھی بے نقاب کیا، مگر مولانا نے بے ضرورت کبھی بھی انقلاب کی بات نہیں کی، بلکہ ان کے سامنے ﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ﴾ (میں تو صرف سنوارنا چاہتا ہوں جتنا بھی میں کر سکوں اور مجھے توفیق اللہ ہی کی طرف سے ملتی ہے) کی تعبیر ہوتی تھی، مولانا فرماتے تھے کہ ان حکمرانوں کو اگر اپنی کرسی کا خوف ہوا تو وہ کرسی چھوڑنے کے بجائے کرسی توڑنے کو ترجیح دیں گے، اور حالات اور ابتر ہو جائیں گے، اس سے بہتر یہ ہے کہ اہل اقتدار تک صحیح بات پہنچائی جائے اور اس کے لیے بہتر طریقہ اختیار کیا جائے، اسی لیے مولانا فرماتے تھے کہ جو دروازہ کھلا ہو اس سے داخل ہونے کی کوشش کرو تو تمہارے لیے سب دروازے کھلتے چلے جائیں گے، اس کے لیے حضرت مولانا کے سامنے امام سرہندیؒ کا نمونہ تھا جن کی کوششوں کے نتیجہ میں اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا حکمراں ہندوستان کو نصیب ہوا۔

حضرت مولانا کی کوششوں کا دائرہ ہمہ گیر بھی ہے اور متنوع بھی ہے، وہ ایک

مفکر، معلم، مربی، مصلح، مجدد، صاحب بصیرت عالم اور بزرگ تھے، مختلف حیثیتوں سے ملت اسلامیہ نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

حضرت مولانا کو بجا طور پر بیسوی صدی کی اسلامی شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی بنیادی وجہ مولانا کی یہی وہ جامعیت واعتدال ہے جس میں وہ سب میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

دعوتِ دین

دین خالص کی دعوت اس امت کا شعار ہے، گذشتہ امتوں نے وہ سرمایہ ضائع کردیا جو ان کو اپنے اپنے زمانوں میں انبیاء ومرسلین سے حاصل ہوا تھا، یہ صرف اسی امت کی خصوصیت ہے کہ اس نے دین کے ایک ایک جزء کو محفوظ رکھا، اور ہر زمانہ میں جب بھی دین کے کسی شعبہ پر افتاد پڑی، اس وقت کے مصلحین امت اور مجددین دین کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس کا مقابلہ کیا، صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے اور دین کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے بھی انہوں نے تگ ودو کی، اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کو بیگانوں میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کے حدود میں توسیع کا فریضہ بھی انجام دیا، دعوت واصلاح کا یہ عمل ہر زمانہ میں جاری رہا، اس کی رفتار کبھی تیز ہوئی اور کبھی سست، لیکن کسی دور میں یہ مکمل جمود وتعطل کا شکار نہیں ہوا، اور حوادث کے طوفان تیز تر کے باوجود اس کے چراغ کو کوئی گل نہ کرسکا۔

ہوا ہے گو تیز و تند لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

دعوت کے اس کام کو انجام دینے میں خادمین اسلام نے ہمیشہ حکمت دعوت کی اس قرآنی تعلیم کو پیش نظر رکھا:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵)

(اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ
بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے)

مقصود حقیقی کو سامنے رکھتے ہوئے، قرآن و حدیث کے اصولوں کو برتتے ہوئے، حالات اور تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے ہر دور میں علماء اس فریضہ کو ادا کرتے رہے ہیں۔

دعوت واصلاح کی تاریخ کا جائزہ لینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصول دین میں پورے تصلب کے ساتھ دعوت کے طریقۂ کار میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہی ہے، نفسیات انسانی اور زمان و مکان کی ہمیشہ اس میں رعایت کی جاتی رہی ہے، اور یہ دعوت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اگر اس کو نظر انداز کیا گیا تو اس میدان میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

معتدل فکر کی دعوت

موجودہ دور میں اگر اسلامی مکاتب فکر کا مطالعہ کیا جائے تو بنیادی طور پر تین مکاتب فکر ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک مکتب فکر تو وہ ہے جس میں صرف اندرونی اصلاحات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور مسلمانوں کی پستی کا راز صرف اسی کو بتایا گیا ہے۔ دوسرے مکتب فکر میں مقابلہ کی پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ حق تو صرف غالب ہونے ہی کے لیے ہے، اس کو غالب کرنا ہے، ذرائع اور وسائل کچھ بھی اختیار کیے جائیں۔ اس میں اس کی ضرورت کم سے کم محسوس کی جاتی ہے کہ حق کے غالب نہ ہونے کے اسباب پر بھی غور کیا جائے، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرا مکتب فکر درمیانی ہے، جس میں اعتدال کی دعوت دی گئی ہے، ایک طرف اندرونی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف غلبۂ حق کے لیے کوشاں رہنے کو ایک دینی ضرورت بتایا گیا ہے۔ یہ وہ معتدل اور متوازن مکتب فکر ہے جس کی دعوت حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری طاقت کے ساتھ پیش کی

ہے، اور اس کی عملی تدابیر اختیار فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا کے نزدیک سب سے پہلی ضرورت اندرونی اصلاحات کی ہے، پھر دین کو اقتدار تک پہنچانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے مولانا نے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے حکیمانہ راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے، مولانا کے نزدیک اس کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اس طبقہ کو متاثر کیا جائے جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار آنے والی ہو، یا وہ کسی بھی شعبۂ زندگی میں بنیادی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس طبقہ نے اگر صحیح دینی فکر قبول کر لی تو غلبۂ دین کی کوششیں آسانی سے کامیابی حاصل کر سکتی ہیں، اور اگر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی گئی تو اس میں صلاحیتوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، حضرت مولانا نے اس کے لیے جو عملی اقدامات کیے ہیں، ان کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا کی سب سے پہلی کوشش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ (Intellectual Class) کو متاثر کیا جائے، مولانا نے اس طبقہ کی نفسیات کو سمجھا ہے، اور اس کو ایسے اسلوب میں خطاب کیا ہے جس سے وہ مانوس ہو، مولانا کی اکثر تصنیفات اور خطاب اس طبقہ کے لیے خاص طور پر اثر انگیز ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت مولانا کی معرکۃ الآراء تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) کو ملی، اس کتاب نے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر زبردست اثر ڈالا ہے، طرز فکر کو بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اور معتدد ملکوں میں اس کتاب کے بہترین مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

مولانا نے اس سلسلہ میں متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلباء اور ذمہ داروں کو خطاب کیا ہے اور خاص طور پر نظام تعلیم کو صحیح رخ دینے کی کوشش کی ہے، رائج نظام تعلیم کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے اور خاص طور پر اسلامی ملکوں میں نئے نظام تعلیم کو نافذ کرنے کی طاقتور دعوت پیش کی ہے۔

متعدد اسلامی ملکوں کے وزرائے تعلیم کے سامنے خطاب کا بھی مولانا کو موقع ملا، مولانا نے اس موقع پر دل نکال کر رکھ دیا اور زبانِ دل سے گفتگو کی، یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر بھی ذہن سازی کی کوشش کی، مولانا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اس کو خاص اہمیت دی ہے اور ملک کی ترقی کے لیے اور اس کو صحیح رخ دینے کے لیے سب سے زیادہ اہم نظام تعلیم ہی کو قرار دیا ہے۔

مولانا کا دوسرا کام یہ ہے کہ انھوں نے حکمراں طبقہ کو متاثر کیا اور اس کی ذہن سازی کی کوششیں کی ہیں، ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی، خطاب کے ذریعہ سے بھی اور خاص طور پر مراسلت کے ذریعہ سے، مختلف ملکوں میں اس کے بہتر نتائج مرتب ہوئے، اس کی کچھ تفصیلات انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ناظرین کے سامنے آئیں گی۔

حضرت مولانا نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ ادب کو اصلاح وتجدید کا ذریعہ بنایا، اس زمانے میں ادب پر ملحدانہ افکار رکھنے والے ادباء ومفکرین کی چھاپ تھی، جس کے نتیجہ میں نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ تیزی سے الحاد کی طرف جارہا تھا اور ادب کے راستہ سے دین بیزاری پیدا ہورہی تھی، حضرت مولانا نے صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر ادب کی لگام اسی طرح ملحدوں کے ہاتھ میں رہی تو نوجوانوں کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا، مولانا نے عربی زبان وادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، عربی ادب کی پوری تاریخ ان کے سامنے تھی، مولانا نے خود کمان سنبھالی اور عربی ادب کی تحریک کو ایک نیا رخ دیا، مولانا نے ایک طرف اس کی دعوت دی کہ ادب کی سرحدوں کو وسیع کیا جائے، دوسری طرف خود مولانا نے عربی زبان وادب کے بہترین نمونے پیش کیے، اس طرح ادب پر ترقی پسند ادباء کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عربی ادب کے افق پر جابجا اسلام پسند ادباء نظر آنے لگے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ جو اب تک تخریبی ادب سے مانوس تھا، اس کے سامنے تعمیری ادب کے بہترین نمونے آئے، وہ اس سے متاثر ہوا، اور اس کے ذہن وفکر میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

ہر قوم کے عروج وزوال کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے، قوموں کے مستقبل پر اس کا اثر پڑتا ہے، کوئی ترقی پذیر قوم اپنی تاریخ سے صرف نظر نہیں کر سکتی، اس میں اس کے لیے سیکڑوں ایسے مقامات آئے ہیں جن سے اس کو سبق حاصل ہوتا ہے اور آگے کے سفر میں سہولت ملتی ہے، مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اسی نظر سے کھنگالا ہے، اس کے نشیب وفراز کو پرکھا ہے، اور ملت کو اس میں سے قیمتی موتی نکال کر دیے ہیں، اور کاروان ملت کے مسافروں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ملکی سطح پر حضرت مولانا کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے ملک میں مسلمانوں کے تحفظ وبقاء کے لیے زمین ہموار کی ہے، ''پیام انسانیت'' کی تحریک چلا کر مولانا نے ملک کے لیے مسلمانوں کی افادیت ثابت کی ہے، اور کسی بھی قوم کے بقاء اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نافعیت اور افادیت ثابت کرے، اس تحریک سے یہ اہم ترین ضرورت پوری ہوئی ہے، اور دوسرے دعوتی کاموں اور اصلاحی وفکری تحریکات کے لیے بھی زمین ہموار ہوئی ہے۔

دین کو برسر اقتدار لانے کے دو راستے

دعوت واصلاح کا کام اگر طبقہ امراء وحکام میں انجام دینا ہے تو اس کے لیے بڑے حزم واحتیاط اور حکمت کی ضرورت ہے، زمان ومکان کے تغیرات کا حالات پر گہرا اثر پڑتا ہے، اور اس کی رعایت دعوت کی بنیادی ضرورت ہے۔

مختلف ادوار کے دعاۃ ومصلحین اور مجددین دین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طریقۂ کار کے جزوی اختلافات اور تغیرات کے باوجود دین کو برسر اقتدار لانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور ضروری ہیں، لیکن ان میں حالات کی رعایت اور ترتیب کا لحاظ غایت درجہ ضروری ہے، اور عام طور پر اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو بڑی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔

دین کو اقتدار میں لانے کا سب سے پہلا راستہ جو ترتیب کے لحاظ سے بھی مقدم ہے اور اپنی تاثیر اور افادیت میں بھی اس کو اولیت حاصل ہے؛ یہ ہے کہ اہل دین دعوتِ دین کو اس طبقہ میں پہنچائیں جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہو یا وہ آگے اس کی باگ ڈور سنبھالنے والا ہو، اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں اور اس کے لیے مناسب اسلوب اور حکیمانہ طریقہ اختیار کریں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ براہ راست دیندار حضرات کرسی تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور اہم مناصب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کریں۔ بلاشبہ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر اہم اور مفید ہیں اور بعض حالات میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت مناسب ہے جب دعوت و اصلاح کی امید منقطع ہو جائے اور اصلاح کے لیے انقلاب ہی تنہا ایک راستہ باقی رہ جائے، اس وقت طاقت کے خلاف اسلامی اصولوں کے ساتھ جہاد کرنا اور دعوت کے راستہ سے رکاوٹ کو دور کر دینا علمائے امت کا فریضہ ہے، مختلف زمانوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں جو اسلام کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں، تاہم عمومی حالات میں دعوت کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ دین حکام و سلاطین اور امراء کے طبقہ میں پہنچایا جائے، اس کی ذہنی و فکری تربیت کا اہتمام ہو اور ہر ممکن طریقہ پر اس کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جائے، دعوت و اصلاح کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہی طریقہ زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہوا ہے اور اس کے بہترین نتائج سامنے آئے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں مجددین و مصلحین نے اس کی طرف خاص توجہ رکھی ہے۔

سلاطین و امراء کی تربیت و ارشاد کے چند واقعات

سید التابعین حضرت حسن بصریؒ نے خلیفۂ وقت یزید بن عبد الملک کا احتساب کیا، اور کئی موقعوں پر اس کو غلطی پر تنبیہ کی۔ امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون رشید کو بڑا تفصیلی خط بھیجا جس میں اس کی پوری رہنمائی فرمائی۔ امام احمد بن حنبلؒ معتصم خلیفہ عباسی کے زمانہ میں دین حق کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور ''فتنۂ خلق قرآن'' کے موقع پر پوری

عزیمت کے ساتھ مسلک حق پر قائم رہے اور خلیفہ کو مسلک حق کی تلقین کرتے رہے، پھر متوکل کے زمانہ میں اس کو مشورے دیتے رہے اور اس کے اصرار پر کئی روز لشکر میں قیام فرمایا اور اس میں دینی روح اور اسلامی جذبہ بیدار کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔ امام اوزاعیؒ مستقل حکام و امراء کو خطوط کے ذریعہ ہدایات دیتے رہے اور ملاقاتوں میں بھی ایسے مؤثر طریقہ پر نصیحت فرمائی کہ خود بھی روئے اور خلیفہ کو بھی رلایا۔

امام غزالیؒ کو سلطان سنجر سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں اس کو ٹوکا، اور اس کے بڑے بھائی محمد کو جو اپنے وقت کا سب سے بڑا حاکم تھا ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوف خدا، اور اصلاح ملکی کی طرف متوجہ کیا۔ مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اس لیے امام غزالیؒ نے خاص طور پر سلاطین سلجوقیہ کے وزراء کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے ارسال کیے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فیض عام تھا، خلفائے وقت، وزراء و سلاطین سب کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرماتے۔ خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے ایک گورنر متعین کیا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا، تو شیخ نے خلیفہ کو تنبیہ فرمائی اور گورنر کو معزول کیا گیا۔

اس سلسلہ میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا نام نامی بھی شامل ہے جو اگرچہ سلسلہ نقشبندیہ کے امام اور اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ ہیں لیکن انہوں نے بھی اس کام کو پیش نظر رکھا اور اپنے وقت کے سلاطین و امراء کی رہنمائی فرماتے رہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

> ''آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔''

ان ہی مجددین و مصلحین کی فہرست میں امام ابن تیمیہؒ بھی شامل ہیں، جنہوں نے تاتاریوں کے بادشاہ قازان سے بڑے حکیمانہ انداز سے گفتگو کی، وہ اگرچہ ملک شام فتح کر چکا تھا، لیکن امام کے حکیمانہ کلام سے بہت متاثر ہوا اور ان کی سفارش سے مسلمانوں کی بڑی تعداد جو اس کے یہاں قید تھی رہا کر دی اور امام کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ ۷۰۰ھ میں تاتاریوں کے دوبارہ حملہ کی اطلاع ملی تو امام ہی کی سفارش اور گفتگو سے سلطان مصر اپنی فوجوں کے ساتھ مدد کو آئے۔

۷۰۲ھ میں تاتاریوں سے سخت مقابلہ ہوا اور مسلمان فاتح ہوئے اس میں بھی امام ابن تیمیہؒ کے مشورہ اور رہنمائی کا خاص حصہ تھا۔

اس باب میں سب سے نمایاں نام شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ کا ہے۔ سلاطین وقت ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے خود کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا گوارہ نہیں کیا، لیکن بادشاہ وقت نے اگر خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گیے اور اس کو صحیح مشورے دیئے اور اس کی اور اسلام و مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

یہ شیخ کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے سلطان الملک الاشرف کو تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے آمادہ کیا اور ملک میں فسق و فجور کا جو دور چل رہا تھا بادشاہ کو متوجہ کیا کہ اس پر پابندی لگائی جائے، سلطان نے اسی وقت ان تمام چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کر دیئے۔

اس طرح جب تاتاریوں کا رخ مصر کی طرف ہوا اور وہاں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوتی تھی، تو شیخ نے ہی اس کو ہمت دلائی اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو میں فتح کی ضمانت لیتا ہوں، جب اس نے مال کی کمی کا عذر کیا تو فرمایا کہ پہلے محل کے جواہرات اور بیگمات کے زیورات نکالے جائیں، ان کے سکے ڈھلوا کر لشکر میں تقسیم کیے جائیں، اس سے انشاء اللہ مصارف جنگ پورے ہو جائیں

گے۔ شیخ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے جواہرات و زیورات حاضر کر دیئے اور اس سے مصارف جنگ پورے ہو گئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

شیخ کے مصر کے زمانہ قیام میں متعدد حکام و سلاطین تخت نشین ہوئے، شیخ ان کی رہنمائی فرماتے رہے، خاص طور پر الملک الظاہر بیبرس شیخ کا بڑا قدرداں تھا، متعدد اہم فیصلے اس نے شیخ کے ہی مشورہ سے کیے اور شیخ ہی کی توجہ سے اس نے تاتاریوں اور صلیبیوں پر پے در پے حملے کیے اور فتوحات حاصل کیں۔

ہندوستان کے علماء و مشائخ اور مصلحین و مجددین بھی اپنے اپنے دور میں یہ فریضہ انجام دیتے رہے، گیارہویں صدی کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا نام نامی اس باب میں سب سے نمایاں ہے جنہوں نے سلطنت مغلیہ کی چول بٹھانے کا کام کیا اور اکبر کے الحاد و زندقہ کے نتیجہ میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا آہستہ آہستہ انہوں نے اس کی اصلاح کی، یہ حضرت مجدد کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جہانگیر کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے بعد شاہ جہاں سریر آرائے سلطنت ہوا، وہ اپنی ذات سے فرائض شرعی کا پابند تھا، علماء و صلحاء کو قریب رکھتا تھا اور ان کا احترام کرتا تھا، اس نے بعض خلاف شرع رسوم و آداب پر بھی پابندی لگائی، اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا بادشاہ تخت پر بیٹھا جس کو "سادس الخلفاء الراشدین" کہا جاتا ہے، وہ باقاعدہ حضرت مجددؒ کے نامور صاحبزادہ اور جانشین حضرت خواجہ محمد معصومؒ کا دست گرفتہ تھا، بادشاہ کے اصرار پر حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادہ خواجہ سیف الدینؒ کو دہلی قیام کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے براہ راست بادشاہ کی اصلاح و تربیت کا کام کیا، اور صدیوں کے بعد عالم اسلام کو ایسا صالح بادشاہ نصیب ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانہ میں اگرچہ سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا، لیکن شاہ صاحب نے جو ممکن ہو سکا اس کی تقویت و اصلاح کا سامان بہم

پہنچایا، بادشاہ کی بھی مقدور بھر رہنمائی کی اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کو خاص طور پر خطوط کے ذریعہ سے مناسب ملکی و عسکری اقدامات کی طرف متوجہ کیا، پھر شاہ صاحبؒ کی توجہ و مراسلت سے احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا آخری مرتبہ رخ کیا اور مرہٹوں کو شکست فاش دے کر حکومت مغلیہ کا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوشش کی اور واپس اپنے ملک روانہ ہو گیا۔

حضرت مولانا کا طریقۂ فکر

اس اخیر دور میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام نامی اس باب میں سب سے زیادہ روشن ہے، جنہوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر اصحاب اقتدار و سطوت کی رہنمائی کی اور ذہنی و فکری تشکیل کے لیے حکیمانہ کوشش کیں، حضرت مولانا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ دینی و علمی ماحول تھا اور اس میں تاریخ و ادب کی آمیزش تھی۔

علوم شریعت کے علاوہ تاریخ و ادب کا اچھا ذخیرہ گھر کے کتب خانہ میں موجود تھا، حضرت مولانا نے اس سے فائدہ اٹھایا، تعلیم کے دوران پھر اسی تعلیم سے فراغت کے بعد خاص طور پر مطالعہ میں وسعت اور انہماک پیدا کیا، عالم اسلام کی تاریخ بھی پڑھی، دوسرے ادیان و مذاہب کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا اور حالات حاضرہ پر مشتمل مواد سے بھرپور کتابوں کو بھی دیکھا، انگریزی میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ضروری مواد کا مطالعہ براہ راست ممکن ہو سکے، دعوت کی تڑپ کے ساتھ تاریخ کا خاص ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا، مطالعہ کی وسعت سے اس کو جلا ملی، تاریخ کا مطالعہ حضرت مولانا نے دعوتی فکر و نظر سے کیا اور اس سے وہ لعل و گہر تلاش کیے جن کی طرف عام طور پر محققین کی نگاہ نہیں پہنچتی، چودہ صدیوں پر محیط دعاۃ، مصلحین اور مجددین دین کے تجربات سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دعوتی میدان میں جگہ جگہ اس سے کام لیا، انہوں نے تاریخ کے مطالعہ سے دعوت کے وہ زریں اصول پیش فرمائے جو صدیوں دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کرتے رہیں گے۔

شیخ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ ہم تاریخ وسیرت کی کتابیں پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، لیکن شیخ ان میں سے وہ لعل و جواہر تلاش کر لیتے ہیں جن کی طرف ہماری نگاہ بھی نہیں پہنچتی۔

حضرت مولانا کی زندگی ان تمام بنیادی صفات سے آراستہ تھی جو وسیع پیمانہ پر دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہوتی ہیں، وہ حقائق پر گہری نگاہ رکھنے والے، حکمت وتدبیر کے امام، زبان وادب کے رمز شناس ہی نہیں بلکہ اس کو نیا رُخ دینے والے، ساری انسانیت کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھنے والے، فکر امت میں سیرت نبوی ﷺ کی جھلک لیے ہوئے اور اخلاق نبوی ﷺ کا پرتو تھے۔

ایک داعی کے لیے خاص طور پر جب اس کو ملوک وامراء کے طبقہ میں کام کرنا ہو، ایک اہم اور بنیادی صفت زہد واستغناء کی ہے، مولانا کی زندگی میں اس کے ایسے واقعات موجود ہیں جو سلف صالحین کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ ملوک وامراء ان کے در پر آئے، شاہوں کے محلات میں تشریف آوری کی درخواست قبول فرمائی مگر اسی داعیانہ مزاج اور شان استغناء کے ساتھ، اپنی بات کہی مگر اخلاق کریمانہ کے ساتھ، زہد و استغناء کے بعد عام طور پر مزاج میں جو حدت اور خشکی پیدا ہو جاتی ہے اس سے کوسوں دور، یہ جامعیت اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

دین کو اقتدار میں لانے کے لیے مولانا دعوت کے پہلے طریقۂ کار ہی کو مناسب اور موزوں خیال فرماتے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا طریقۂ دعوت وارشاد ان کے سامنے تھا۔

۱۴۱۴ھ میں شکاگو کی ایک مجلس میں سوال کیا گیا کہ دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کیسے قائم ونافذ ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ :

"دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ دین وایمان والوں کو کرسی تک پہنچایا جائے یا پھر دین وایمان کو کرسی والوں تک پہنچایا جائے، پہلے

طریقۂ کار میں خدشہ اس بات کا ہے کہ کرسی والے کرسی چھوڑنے پر کرسی توڑنے کو ترجیح دیں اور معاملات احسن کے بجائے اور ابتر ہوجائیں، دوسرا طریقہ مدت طلب ضرور ہے، لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارہ کار بھی نہ ہو، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک تجدید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ کرسی کرسی والوں ہی کو مبارک ہو، دیندار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی۔''(۱)

دور اکبری اور حضرت مجدد صاحب کی مثال

اکبر نے جس دین الٰہی کا صور پھونکا تھا، اسلام اور احکام شریعت کو مٹادینے کی جو کوششیں شروع کی تھیں، اس سے یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر حالات یہی رہے اور کوئی طاقتور یا انقلاب انگیز واقعہ پیش نہ آیا تو اس ملک کا انجام گیارہویں صدی ہجری میں وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اندلس کا ہو چکا تھا، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد صاحب کو اس کے لیے کھڑا کیا، حضرت مولانا تاریخ دعوت و عزیمت کے حصہ چہارم میں جو حضرت مجدد صاحب اور ان کے خلفاء کے ساتھ مخصوص ہے، تفصیل سے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت حضرت مجدد اور ان سب حضرات کے لیے جو علم دین اور کمال باطن سے آراستہ، خود مشغول اور سیر فی اللہ کی دولت سے مالا مال اور دینی حمیت و غیرت کے نشہ سے سرشار تھے، اس صورت حال کے سامنے جو اس وقت قلمرو سلطنت پر سایہ فگن تھی، تین راستے تھے:

۱- سلطنت اور ملک کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے لیے کسی ایسے گوشہ کا انتخاب، جہاں اطمینان کے ساتھ یادِ خدا میں مشغولی، طالبین کی تربیت اور ذکر و عبادت کی یکسوئی اور سرگرمی میسر آسکتی تھی، یہ وہ طرز

(۱) کاروان زندگی: ۵/۲۵۲-۲۵۳

عمل تھا جو حضرت مجدد کے عہد میں بیسیوں بلکہ صدہا علماء ومشائخ نے اختیار کیا، ملک کے چپہ چپہ پر ان کی خانقاہیں تھیں اور وہ پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ کام کر رہے تھے، اور خلق خدا کو ان سے بیش بہا روحانی وایمانی فوائد پہنچ رہے تھے۔

۲- ہندوستان کی برائے نام مسلم سلطنت اور اس کے فرمانروا کو (جس کو صرف مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کا شرف حاصل تھا) اسلام کا مخالف اور معاند سمجھ کر (جس کے ثبوت کے لیے بہت سے آئین وضوابط اور ذاتی اعمال واخلاق مل سکتے تھے) اس کی اصلاح سے یکسر مایوس ہو جانا، اس کے خلاف ایک دینی محاذ قائم کر لینا اور اسلام کا اس کو مستقل حریف اور مقابل سمجھ کر اس کی مستقل مخالفت اور اس کے خلاف صف آرائی۔

اور اگر اس سے کام نہ چلے تو دینی حمیت، جہاد وسرفروشی کا جذبہ رکھنے والے اور موجودہ صورت حال سے بیزار، معتقدین ومریدین ورفقاء کو مجتمع کرنا اور کسی فوجی وسیاسی کارروائی کے ذریعہ سلطنت میں انقلاب لانا اور تخت سلطنت پر کسی زیادہ صالح اور دیندار شخص کو (خواہ وہ خاندان مغلیہ ہی سے تعلق رکھتا ہو اور بابر کی اولاد میں ہو) بٹھانے کی کوشش کرنا جو پوری سلطنت کا رخ موڑ دے اور حالات میں یکسر تبدیلی ہو جائے۔

۳- ارکان سلطنت وامرائے دربار سے تعلقات پیدا کر کے اور جن سے پہلے سے تعلق ہے، اور وہ آپ کی ذات سے عقیدت اور آپ کے خلوص اور دلسوزی پر پورا اعتماد رکھتے ہیں، ان میں دینی جذبہ اور حمیت ابھار کر اور ان کے دلوں کے خاکستر میں جو ایمانی چنگاریاں

دبی ہوئی ہیں، ان کو فروزاں کر کے بادشاہ کو نیک مشورہ دینے پر آمادہ کرنا، اس کی رگ اسلامیت کو جو اپنے باایمان اسلاف واجداد سے اس کو ورثہ میں ملی ہے، جنبش میں لانا، اس کو اسلام کی حمایت، مسلمانوں کے مجروح دلوں کی چارہ سازی اور گزشتہ دور کی تلافی پر آمادہ کرنا، خود ہر طرح کے جاہ ومنصب سے بلکہ اس کے سایہ سے بھی دور رہنا، مکمل زہد واستغناء کا ثبوت دینا، سلطنت کو اہل سلطنت اور مناصب ومراتب کو اہل مناصب ومراتب کے حوالہ کرنا، ایسی عالی نظری اور بے لوثی کا اظہار کہ کوئی شدید سے شدید مخالف اور حاسد بھی جاہ طلبی یا حصول اقتدار کی تہمت نہ لگا سکے اور کوئی مخالفانہ سازش بھی اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جہاں تک پہلے نمبر کا تعلق ہے وہ حضرت مجدد کی افتادِ طبع، ان کی شان عزیمت اور اس رفیع منصب سے جس سے اللہ نے ان کو سرفراز کیا تھا، کوئی مناسبت نہیں رکھتا، حضرت مجدد کو اپنی باطنی تکمیل وتربیت کے بعد ہی اس بات کا اذعان پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی دوسرا ہی کام لینا منظور ہے، اور وہ محض لازمی وانفرادی عبادات و ترقیات اور پیری ومریدی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، انہوں نے اپنے سلسلہ ہی کے ایک رفیع المرتبت شیخ اور امام سلسلہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ) کا یہ مقولہ نقل کر کے "حدیث دیگراں" میں "سرّ دلبراں" کہہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ احرار فرماتے تھے:

"اگر من شیخی کنم ہیچ در عالم مرید نیابد امام مرا کار دیگر فرمودہ اند، وآں ترویج شریعت وتائید ملت است"۔

(اگر میں خالی پیری مریدی کرنے پر آجاؤں تو دنیا میں کسی پیر کو کوئی

مرید نہ ملے، لیکن خدا نے مجھے کچھ اور ہی کام سپرد کیا ہے، اور وہ ترویج شریعت اور تائید ملت ہے)

پھر اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لاجرم بصحبت سلاطین می رفتند و بتصرف خود ایشاں را منقاد می ساختند و بتوسل ایشاں ترویج شریعت می فرمودند'' (۱)

(آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے)

جہاں تک نمبر دو کا تعلق ہے، یہ ایک سیاسی ذہنیت رکھنے والے کوتاہ نظر داعی یا قائد کا طرز عمل ہوسکتا ہے، جو اپنا کام شک و بدگمانی سے شروع کرتا ہے، اور اپنی عجلت پسندی، حکمت دعوت اور جذبہ خیر خواہی و نصیحت پر محاذ آرائی کو ترجیح دینے کے نتیجہ میں حکومت و اقتدار کو اپنا حریف اور مدمقابل بنالیتا ہے، اور دین کے غلبہ کے امکانات اور میدان کو اور زیادہ تنگ کرلیتا ہے، ایک داعی الی اللہ اور مؤید من اللہ کا طریق کار نہیں ہوتا، جس کا مقصد اپنی ذات یا جماعت کے لیے حصول اقتدار نہیں صرف دین کا غلبہ اور احکام شریعت کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کے ہاتھ سے ہو۔

جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے، وہ سخت خطرات سے بھرا ہوا تھا، اور ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی نقشہ اور ماحول میں اسلام کے بارے میں ایک طرح سے خودکشی کا اقدام تھا، سلطنت مغلیہ میں جس کو بابر نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے قائم کیا تھا، ہمایوں نے اس کے

(۱) مکتوبات دفتر اول مکتوب: ۶۵، بنام خانِ اعظم

لیے ایران کا تحفظ خواں طے کیا تھا، اور اکبر نے اپنی پے در پے فتوحات اور تسخیر ملک سے اس کو مستحکم کیا تھا، ابھی تک ضعف کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے، شیر شاہ سوری جیسے الوالعزم بادشاہ کا جانشین سلیم شاہ اس کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا، مختلف وقتوں میں ملک میں رونما ہونے والی بغاوتیں سب ناکام ہوچکی تھیں، پھر اگر مغل فرمانروا کو تخت سلطنت سے اتارنے کی کوشش کامیاب بھی ہوجاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ راجپوت جنہوں نے اکبر کے زمانہ میں خاص طور پر اعلیٰ مناصب حاصل کر لیے تھے اور جن کی فوجی طاقت خود فرمانروائے سلطنت کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد سرمایہ تھا، حکومت پر حاوی ہوجاتے اور اس ملک میں مسلم اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہوسکتا تھا۔

پھر یہ تجربہ اس سے پہلے ناکام ہو چکا تھا، اکبر کے زمانہ میں شیخ بایزید کی جو پیر روشن اور پیر تاریک کے متضاد ناموں سے مشہور ہیں، قیادت میں ایک بڑی دینی تحریک اور تنظیم فرقہ روشنائیہ کے نام سے شروع ہوئی تھی، اس نے سالہا سال سلطنت مغلیہ کی افواج قاہرہ کا پامردی سے مقابلہ کیا، اس نے کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ جمالیا اور قرب و جوار کے علاقوں پر بھی حملہ آور ہوئی، اکبر نے ان کے مقابلہ کے لیے راجہ مان سنگھ اور راجہ بیربل اور زین خاں کو بھیجا، لیکن وہ سب ناکام رہے، بیربل ایک مقابلہ میں مارا گیا، روشنائیوں نے ایک بڑے لشکر کی مدد سے غزنی پر بھی قبضہ کرلیا، یہ فتنہ جہانگیر کے عہد ہی میں فرو ہوسکا اور اس کا پورا خاتمہ شاہجہاں کے زمانہ میں ہوا، لیکن اس کے باوجود اس بغاوت کا سوائے انتشار

کے کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بالآخر اس کو منظم و مستحکم مغل سلطنت کے سامنے سپر ڈالنی پڑی اور تاریخ میں صرف اس کا نام رہ گیا۔

اس طرح کے فوجی اقدامات جو کسی اصلاح کے نام سے کیے جاتے ہیں، سلطنتوں اور اصحاب اقتدار کی مختلف بدگمانیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں اور وہ دین کو اپنا حریف و رقیب سمجھ کر اس کے استیصال اور اس کے ہم خیالوں اور پیروؤں کی تلاش و جستجو کر کے ان کا قلع قمع کرنے کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، ایک روایت کے مطابق اسی بنا پر گوالیار کی اسیری اور لشکر کی ہمراہی سے رہائی پانے کے چار پانچ سال بعد ۱۰۳۵ھ میں عہد جہانگیری کے مشہور امیر و وزیر مہابت خاں نے بغاوت کی تو اہل بصیرت نے اس کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی، مجدد صاحب کی فراست ایمانی کی بہت بڑی دلیل اور توفیق الٰہی کا یہ روشن ثبوت تھا کہ انہوں نے حالات میں انقلاب لانے کے لیے پر خطر اور مشتبہ راستہ اختیار نہیں کیا اور تخریب کے بجائے تعمیر، نفی کے بجائے اثبات و ایجاب، اور ازالہ کے بجائے امالہ کا راستہ اختیار کیا، جو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ اور ایک بے ضرر راستہ تھا۔

اب مجدد صاحب کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا، اور وہ یہی کہ ان ارکان سلطنت سے رابطہ قائم کریں جو بہر حال مسلمان تھے، حضرت مجدد صاحب کو اپنی گہری واقفیت اور خداداد ذہانت سے معلوم تھا کہ دور اکبری کے مخالف اسلام منصوبہ میں وہ شریک نہیں تھے، وہ اکبر کے بہت سے اقدامات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن مجبور تھے، ان میں متعدد اسلام کی محبت اور دین کی حمیت سے بھی خالی نہ تھے، ان میں سے کئی ان کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ اور خود ان

سے اگر ارادت کا نہیں تو محبت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے، وہ حضرت مجدد کے اخلاص و بے غرضی اور اسلام کے لیے دلسوزی اور دردمندی سے واقف تھے، ان میں حسب ذیل حضرات ممتاز تھے، نواب سید مرتضی عرف شیخ فرید (م ۱۰۱۵ھ) خان اعظم مرزا کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) خان جہاں لودھی (م ۱۰۴۰ھ) صدر جہاں پہانوی (م ۱۰۲۷ھ) لالہ بیگ جہانگیری۔

مجدد صاحب نے انہیں امرائے کبار اور ارکان سلطنت کو اپنا مخاطب بنایا، ان سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا اور صفحہ قرطاس پر اپنے دل کے ٹکڑے اتار کر رکھ دیے، یہ خطوط اپنے درد واخلاص، جوش وتاثیر، زور قلم اور قوت انشاء کے لحاظ سے ان خطوط ومکاتیب کے مجموعہ میں جو دنیا کی کسی زبان میں اور کسی دینی اصلاح وتحریک کی تاریخ میں سپرد قلم کیے گئے ہیں، خاص امتیاز رکھتے ہیں، اور سینکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی آج بھی ان میں اثر و دلآویزی پائی جاتی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مکتوب الیہم کے دلوں پر کیا اثر ڈالا ہوگا، حقیقت میں یہی خطوط مجدد صاحب کی دعوت وتبلیغ کے قاصد، ان کے زخمی دل کے صحیح ترجمان، ان کے قطرات اشک اور ان کے لختہائے جگر ہیں، اور دسویں صدی میں ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا، اس میں ان کا بنیادی حصہ اور سب سے بڑا دخل ہے"۔(۱)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا یہ اقتباس گرچہ خاصا طویل ہوگیا ہے، مگر اس سے حضرت مولانا کی کے طرز فکر کی پوری وضاحت ہوجاتی ہے، حضرت مولانا کی

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت: ۴/ ۳۰۹-۳۱۵

پوری دعوتی زندگی اسی کی آئینہ دار و ترجمان نظر آتی ہے۔

معاصر تحریکات کے بارے میں مولانا کا طرز فکر

دینی تحریکات اور جماعتوں کے بارے میں مولانا یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ ممکن حد تک سیاست سے علاحدہ ہو کر دینی و فکری رہنمائی کا کام کرتی رہیں، اور قبل از وقت سیاسی یا انقلابی اقدام سے گریز کریں۔

تحریک اخوان المسلمین سے حضرت مولانا کا گہرا تعلق رہا ہے، اس کے بانی و قائد اول شیخ حسن البناء کے بارے میں حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''ان اصحاب سے جو کچھ سنا اور خود شیخ کے جو اثرات دیکھے اس سے اس بات کا یقین پیدا ہوا کہ ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی جو اللہ تعالیٰ کسی تحریک و دعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے پیدا فرماتا ہے، اور اس کی قیادت کی وسیع اور متنوع صلاحیتیں عطا فرماتا ہے، وسیع و روشن دماغ، گرم و پرمحبت و دردمند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کر لینے والے اخلاق اور دل آویز شخصیت یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے، میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البنا کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ان ہی کو دیکھ کر کہا ہے:
>
> نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
> یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے(۱)

خود اخوان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''راقم سطور کے سامنے چونکہ ان ممالک کی سابقہ زندگی اور موجودہ

---

(۱) تحریك اخوان المسلمین: ۴۳

دینی وفکری انقلاب ہے اور اس کو اپنے طویل قیام کی بنا پر اس کا مشاہدہ وتجربہ ہو چکا ہے کہ اخوان نے جدید نسل کے دل ودماغ کو کس طرح متاثر کیا ہے اور دین وشعائر دین کے اظہار واعلان کی کیسی جرأت پیدا کر دی ہے اور جو لوگ دینی مظاہر وشعائر اور دینی عقائد و حقائق کے اظہار میں شرمندگی اور حقارت محسوس کرتے تھے اب کس طرح اظہار کرتے ہیں، ان ذاتی مشاہدات وتجربات کا نتیجہ تھا کہ میری زبان سے ایک تقریر میں اخوان کے متعلق بے ساختہ یہ لفظ نکل گئے کہ "لا یحبهم الا مؤمن ولا یبغضهم الا منافق" (اخوان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے)(۱)

مگر اس کے آگے کی تحریر سے مولانا کے طرز فکر کا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اگر اخوان کچھ عرصہ اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیتے (یا اس عملی سیاست میں الجھا نہ دیے جاتے) اور اپنا اصلاحی ودعوتی کام پوری قوت سے جاری رکھتے تو ممالک عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو جاتا اور ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی، مجھے مستند اور باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شیخ حسن البناء کو خود اس کا شدید صدمہ اور قلق تھا کہ ان کو قبل از وقت سیاسی میدان میں اترنا پڑا اور ان کا دامن ان کانٹوں سے الجھ گیا، ان کو اس کی بڑی تمنا تھی کہ ان کو پھر خالص دعوتی وتربیتی کام کا موقع ملے اور وہ جماعت اور جمہور مسلمین میں وہ استعداد پیدا کر لیں جس کے بعد وہ ہر طرح کی ذمہ داری کو پورا کر سکیں اور ہر امتحان وآزمائش

(۱) تحریك اخوان المسلمین: ٤٧

سے گزر سکیں"۔(۱)

اسی طرح جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے سلسلہ میں بھی حضرت مولانا کی یہی رائے تھی کہ انہوں نے قبل از وقت سیاست میں حصہ لیا، جس کا نقصان جماعت کو اٹھانا پڑا، مولانا مودودی کے تذکرہ میں حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"میرا اندازہ ہے کہ ان کو اپنے آخری دور میں اس کا احساس ہو گیا تھا کہ جن پیروؤں اور ہم خیالوں سے وہ اس کی توقعات وابستہ کر رہے ہیں، اور جس معاشرہ کی زمین پر وہ یہ عمارت اٹھانا چاہتے ہیں، اس میں اس کا بوجھ برداشت کرنے اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، اور شاید ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ اس ناگزیر درمیانی منزل کے طے کرنے میں کسی قدر عجلت اور خوش گمانی سے کام لیا گیا، اس کو اس سے زیادہ دینی و اخلاقی تربیت اور انہیں کے الفاظ میں "سیرت سازی" اور تعمیر کردار کی ضرورت تھی جتنی اس کو حاصل ہوئی۔"(۲)

آگے فرماتے ہیں:

"ان کی خداداد ذہانت اور واقعات سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت سے اس کی پوری امید ہے کہ اگر ان کو مہلت ملتی اور ان کی زندگی اور صحت ساتھ دیتی اور جماعت کی زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ جماعت کے فکر و نظام میں بڑی اہم اور دور رس تبدیلیاں کرتے اور افراد جماعت کی اصلاح و تربیت میں بعض مؤثر قدم اٹھاتے، اور "اسلامی حکومت" کے بجائے "اسلامی معاشرہ" کے قیام پر اپنی توجہ کا بڑا حصہ مرکوز کر دیتے، جولائی ۱۹۷۸ء کے

(۱) تحریك اخوان المسلمین: ۴۷-۴۸ (۲) پرانے چراغ: ۲/۲۶۶-۲۶۷

آخری ہفتہ میں جب میری ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی اور میں نے ہندوستان میں ''پیام انسانیت'' کی تحریک اور پاکستان میں بھی اسی کے مماثل کسی تحریک کی ضرورت کا ذکر کیا اور معاشرہ کی اخلاقی گراوٹ اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس کی تحسین فرمائی اور تائید وہمت افزائی کے کلمات کہے۔''(۱)

تبلیغی جماعت کے بارے میں بھی حضرت مولانا یہ محسوس کرتے تھے کہ کئی اہم نکات ہیں جن کے اضافے کی اس میں ضرورت ہے، ذمہ داران کو مولانا نے اس کے مشورے بھی دیے اور جب یہ محسوس ہوا کہ بعض دشواریوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے تو اپنے طور پر ان ضروری کاموں کو خود اختیار فرمایا اور ان پر خاص توجہ دلاتے رہے، مگر ہر جگہ حضرت مولانا کا طریقہ یہی تھا کہ پہلے محاسن کا اعتراف ہوتا، پھر اس کے بعد ان کمیوں کی نشان دہی فرماتے جن کو دور کرنے کی وہ ضرورت محسوس کرتے تھے۔

برطانیہ کے ایک سفر میں حضرت مولانا کو درس نظامی، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے مراکز میں جانے کا موقع ملا تو تینوں جگہ مولانا نے ان کے محاسن کے اعتراف کے ساتھ ان ضروری باتوں کی نشاندہی بھی فرمائی، جو ان مراکز وتحریکات کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے بلیغ اسلوب میں ان باتوں کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

''ایک ایسے دینی مدرسہ میں جانا ہوا جو ایک اچھا اور وقیع مدرسہ ہے، لیکن ہندوستان کے قدیم دینی مدارس کے طرز کو اس طرح اختیار کر رکھا ہے کہ اپنے جائے وقوع کے ماحول اور ضرورت پر زیادہ دھیان نہیں دیتا، وہاں مولانا نے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کے دینی مدارس کی جو اہم خصوصیات ہیں، اور ان کی جو ذمہ داریاں ہیں اور وہ

---

(۱) پرانے چراغ: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸

جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں، ان کو سراہتے ہوئے ان کی اصل خصوصیات کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ماحول کے جو دعوتی اور اسلامی تقاضے ہیں، ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ مخاطبین کے حالات اور نفسیات اور ان کی زبان جس میں وہ بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور متاثر ہو سکتے ہیں، ایک عالم دین جس کو اسی ماحول میں رہنا ہے اور کام کرنا ہے، اس پر اسے پوری توجہ دینی چاہیے، تاکہ وہ دعوت کے کام کو صحیح طور پر انجام دے سکے اور اسلام سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کر سکے، ان کے لیے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں رعایت کرنے کی پوری ضرورت ہے، اگر یہ لحاظ نہیں کیا جاتا اور برصغیر میں قائم مدرسہ ہی کی شکل کو بجنسہٖ اختیار کیا جاتا ہے تو یہ ایک اضافی کام قرار پائے گا جو ضرورت کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا۔

مولانا ایک ایسے دعوتی اور فکری ادارہ میں تشریف لے گئے جو اپنے مخصوص فکری اور دعوتی انداز میں کام انجام دے رہا ہے، اور مفید کام انجام دے رہا ہے، لیکن اپنے اس مخصوص فکری اور دعوتی انداز کو ہی تنہا قابل عمل سمجھتا ہے، وہاں مولانا نے ان کے کام کو سراہتے ہوئے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ توجہ دلائی کہ کسی ایک طریقہ کار اور اسلوب دعوت ہی کو دین کی خدمت کا واحد طریقہ نہیں سمجھ لینا چاہیے، اور کسی ایک شکل کو آخری شکل نہیں قرار دینا چاہیے، بلکہ وسعت سے کام لینا چاہیے، دینی دعوت اور فکری سطح سے دین کی خدمت جو بھی اور جہاں بھی اخلاص کے ساتھ انجام پا رہی ہو اس کی بھی قدر کرنی چاہیے اور لائق استفادہ ہو تو استفادہ بھی کرنا چاہیے۔

مولانا ایک دینی دعوت کے مرکز پر تشریف لے گئے جو اصلاحِ عوام کا بہت اچھا کام انجام دینے کے مرکز کے طور پر بڑی خدمت انجام دے رہا ہے، وہاں مولانا نے اس کی دینی جدوجہد اور اصلاحی کام کی وسعت کی اثر انگیزی کو سراہتے ہوئے اور تعریف کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ایک بہت اہم پہلو اس مغربی ماحول میں نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا ہے، اگر ہم نے اس میں اسلامی خصوصیات رکھنے والی تعلیم کا نظم نہیں کیا اور رائج الوقت نظام تعلیم ہی کو کافی سمجھا تو یہ بہت خطرناک نتیجہ پیدا کرنے والی بات ہوگی اور بالکل ممکن ہے کہ باپ بڑا دین دار، تہجد گزار اور اللہ کے سامنے اپنی معصیتوں کو یاد کر کے رونے والا ہو، لیکن اس کا لڑکا ملحدانہ اور اسلامی قدروں سے خالی تعلیم اور ماحول کے اثر سے الحاد کا شکار ہو، اور اپنے باپ کے بالکل متضاد کیفیت اور حالات اختیار کرنے والا ہو، ذہن اس کا مغربی ہو اور مذہب کے سلسلہ میں اس کا ذہن ملحدانہ ہو، اس لیے کہ نوجوان نسل کے خیالات اور اطوار اسی سانچے میں ڈھلتے ہیں، جو اس کے اردگرد کے ماحول کا تعلیمی سانچہ ہوتا ہے۔''(۱)

حضرت مولانا اور سیاست

سیاست کو حضرت مولانا نے شجر ممنوعہ نہیں سمجھا، لیکن موجودہ حالات میں مولانا یہ سمجھتے تھے کہ خود سیاست میں داخل ہو کر کوئی بڑی تبدیلی کی اس وقت توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے جب جب ضرورت پڑی، مولانا نے خطرات کو محسوس کر کے مسلمان سیاسی قائدین کی رہنمائی کی، اندرا گاندھی کے دور میں جب مسلمانوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ مسلمانوں نے کانگریس کے لیے خط غلامی لکھ دیا اور اس کا

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ - عہد ساز شخصیت: ۲۷۹-۲۸۰

کوئی بدل نظر نہیں آتا تھا، تو مولانا نے مسلمان قائدین کو کھڑا کیا اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی قیادت میں مستقل سیاسی جماعت مسلم مجلس کے نام سے قائم ہوئی اور اس نے دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر یہ دکھا دیا کہ مسلمان ہرانا بھی جانتے ہیں، اس وقت ایک اہم ضرورت اس سے پوری ہوئی، لیکن مولانا کو محسوس ہو گیا کہ کوئی مسلم سیاسی جماعت تنہا اپنے طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی، بلکہ اس میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ غیروں میں اس کو دیکھ کر ایک اتحاد اور تعصب پیدا ہو سکتا ہے، اور اکثریت کا اتحاد اقلیت کے خلاف سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔

مولانا کا خیال تھا کہ مختلف سیاسی جماعتوں میں مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی ہونی چاہیے جو مخلصانہ طریقہ پر اپنا کام کرتے رہیں اور ان سیاسی جماعتوں کے قائدین کی صحیح رہنمائی کرتے رہیں، لیکن مولانا اس کو بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ مسلمان اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ دوسری جماعتیں مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھ لیں۔

حضرت مولانا کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ رہنمائی بہت بلندی کے ساتھ ہونی چاہیے، یہ محسوس نہ ہو کہ ہم لینے والے ہیں، بلکہ دینے کی صفت جو مسلمانوں کا امتیاز ہے اس کا مظاہرہ ہوتا رہے، اور مسلمان انسانیت اور ملک کے تحفظ و بقا کے لیے وہ مشورہ دیتے رہیں جس سے مسلمانوں کا اپنا امتیاز باقی رہے، اور وہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں کے تحفظ کو بنیادی ذمہ داری کے طور پر محسوس کریں، اور وہ اس کو خود اپنے اور اپنے ملک کے تحفظ و بقا کا ذریعہ سمجھیں۔

اقامت دین حکمت دین کے ساتھ

اس عنوان کے ذیل میں حضرت مولانا نے پوری وضاحت سے یہ بات لکھ دی ہے کہ وسائل و مقاصد کا فرق ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیے، اقامت دین مقصود ہے، تو اس کے لیے افراد و ابدان بدلنا ضروری نہیں، اصل ضرورت افکار و اذہان کو بدلنے کی ہے،

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''اقامت دین کا یہ شعبہ (اسلام کو غالب اور قوت حاکمہ کا مالک بنانے کی کوشش) بھی کوئی ایسا بے لچک آہنی سانچہ نہیں ہے جو ٹوٹ سکتا ہے، لیکن پھیل نہیں سکتا، جن لوگوں کے اخلاص، رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین پر ہم کو اعتماد ہے، اور اس کے پورے آثار و قرائن، اس کی واضح شہادتیں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، اور یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اہل رخصت میں سے نہیں بلکہ اہل عزیمت میں سے تھے، ان کا یہ حق ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنے زمانہ میں اس مقصد کے لیے جس طریق کار اور جس طرح کی سعی یا جہد کو مناسب و مفید سمجھا اس کو اختیار کیا، اور ان حالات میں جن میں وہ زندگی گذار رہے تھے جو کچھ وہ کر سکتے تھے، اس سے دریغ نہیں کیا اس لیے کہ مقصود نتیجہ ہے نہ کہ وسیلہ، تعمیر ہے نہ کہ تخریب، ایجاب و اثبات ہے، نہ کہ سلب و نفی، کوئی ذی عقل انسان یہ نہیں کہے گا کہ ان کوشش کرنے والوں کے لیے ہر حال میں یہ ضروری تھا کہ وہ بنی بنائی عمارت کو (جس میں کچھ خرابیاں تھیں یا جس کا غلط استعمال ہو رہا تھا) کلی طور پر منہدم کرنے میں اپنی ساری توانائی اور فرصت عمر صرف کر دیں اور اس کو کھنڈر بنا کر دم لیں، پھر اس کی نئی تعمیر کی نوبت آئے یا نہ آئے، مستحکم اور وسیع مسلمان حکومتوں کی موجودگی میں جن کا سربراہ بہت سی اہلیتوں کا مالک بھی ہوتا تھا، اور اس کو بہت سی سہولتیں بھی حاصل تھیں، اگر انہوں نے کلی مخالفت کے بجائے تفہیم و اصلاح اور مشورہ و صلاح سے کام لیا، اور ''ازالہ'' کے بجائے ''امالہ'' کے حکیمانہ اصول پر عمل کیا، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اقامت دین کے

اس شعبہ کو یکسر فراموش کر دیا اور ''تعاون علی الاثم و العدوان'' کے مرتکب ہوئے یا اگر انہوں نے معاشرہ کی اصلاح، جاہلیت سے اسلام کی طرف اس کے رخ کو پھیرنے، نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی، اور معصیت پسندی کے بجائے طاعت پسندی کی طرف اس کو مائل کرنے پر اپنی پوری روحانی، علمی، تقریری اور تحریری قوت لگادی کہ صحیح اسلامی و ایمانی معاشرہ ہی وہ مضبوط اور مسطح زمین ہے، جو ہر وزنی اور بلند عمارت کا بوجھ اٹھا سکتی ہے، اور صالح قیادت کو قبول اور برداشت کر سکتی ہے، اس کے ساتھ انہوں نے مرکز قیادت اور ایوان حکومت سے بھی رابطہ رکھا، حکومت کو شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے، نظم و نسق چلانے اور مالیات کے حصول و صرف کے لیے مفصل قانون مرتب کر کے دیا، حاکم وقت پر اپنی اخلاقی و روحانی بلندی اور اپنے خلوص و بے غرضی کا سکہ بٹھا کر اس کو بارہا اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے اقدام سے بچایا، اس کے ذریعہ قانون شریعت اور حدود الٰہیہ کا اجراء بھی کرایا، دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف صف آرا کیا، جہاد اور مملکت اسلامی کی توسیع کا باعث ہوئے، ایسے خدا ترس، امانت شعار، اور اہل و کارگذار کارکن اس کو مہیا کیے، جن کی انہوں نے سالہا سال اپنے پاس رکھ کر تربیت کی تھی اور بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ انہیں کے اثر سے سلطنت اور مملکت کا نظم و نسق بے دین وارث ملک و تاج سے دیندار جانشین کی طرف، مخالف اسلام سے محافظ اسلام کی طرف، اور ماحی دین سے حامی دین کی طرف منتقل ہوا، ہمیں ان سب کو سعی اقامت دین کا علمبردار، اور تجدید و احیاء دین کی مبارک فوج کا ایک وفادار سپاہی تسلیم کرنا پڑے گا اور اس وجہ سے ہم ان کو اس فہرست سے

خارج اوراس فریضہ سے غافل نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک معیاری حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں ناکام رہے۔"(۱)

تبدیلی اذہان کی نہ کہ ابدان کی

حضرت مولانا کی یہی فکر تھی اور اسوۂ رسول ﷺ اور اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں تاریخ کے گہرے مطالعہ سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اصل فکر تبلیغ دین کی ہونی چاہیے، مقصود یہ نہیں ہے کہ اقتدار سے کسی کو ہٹا کر دوسرے کو بٹھادیا جائے، بلکہ اصل مقصد ذہن وفکر کی تبدیلی ہے، اوراس کے لیے ضرورت ہے کہ دعوت کے وہ اصول اختیار کیے جائیں جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں، جن میں اخلاق نبوی کا عکس ہو۔

مولانا کے اصول دعوت

مولانا اپنے بلیغ الفاظ میں یوں بھی فرماتے تھے کہ ہمیشہ کھلے دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کرو، اگر تم دروازہ توڑ کر داخل ہوگے، یا زبردستی دروازہ کھلواؤ گے تو تمہاری حیثیت دشمن کی ہوگی، پھر تمہاری کوئی بات بھی قابل اعتماد نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ حتی الامکان تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور اگر تم کھلے دروازے سے اجازت لے کر داخل ہوگے تو امید ہے کہ سارے بند دروازے تمہارے کھلتے چلے جائیں گے، مہمان کا بہرحال اکرام کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے اسی کو "کلمۂ سواء" سے تعبیر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے جابجا دعوت کے لیے حکمت اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے اور پھر اسی حکمت کا ایک راستہ اپنے نبی ﷺ کو بتایا ہے، ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (آل عمران: ٦٤)

---

(۱) عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح: ۱۱۹-۱۲۱

(آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے)

پہلے مرحلہ میں اگر وہ بات کہی جائے جس کو مخاطب بھی تسلیم کرتا ہے، تو اس سے اپنائیت پیدا ہوجاتی ہے، یہی وہ کھلا دروازہ ہے جس کے نتیجہ میں دل کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔

اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے تاریخ کے مطالعہ کی، نفسیات کو سمجھنے کی اور پھر اس کے مطابق گفتگو کرنے کی۔

حضرت مولانا نے اہل اقتدار تک بات پہنچانے میں اس کا خاص خیال رکھا ہے، بات پوری کہی، جرأت کے ساتھ کہی، لیکن اسلوب ایسا حکیمانہ کہ کہنے والے کو دشمن یا فریق نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو دوست اور خیر خواہ سمجھا جائے، گفتگو کے راستہ کھلے رہیں، کہیں ایسی سختی نہ ہوجائے کہ اس کے بعد سب راستے بند ہوجائیں، ہر نبی نے اپنی قوم سے یہ بات فرمائی:

﴿وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ (میں تمہارے لیے معتبر خیر خواہ ہوں)

مخاطب کو ذرا بھی اگر یہ شبہ ہوجائے کہ بات کہنے والے کے سامنے اپنی غرض ہے، وہ اپنا فائدہ چاہتا ہے، خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو تو بات بے وزن ہوجاتی ہے، اور اگر وہ اجنبی ہو یا اس کو دشمن سمجھا جارہا ہو تو بغیر غور کیے پہلے مرحلہ میں اس کی بات رد کردی جاتی ہے۔

اپنائیت پیدا کرنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے اس بات کی کہ پہلے مرحلہ میں اس کے سامنے وہ چیزیں رکھی جائیں جو تسلیم شدہ ہوں اور قدرے اعتراف بھی کیا جائے، اور محبت آمیز لہجہ میں گفتگو کی جائے، اس سے دل کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں،

اور اس کے بعد جو بات بھی کہی جائے وہ کسی نہ کسی درجہ میں اثر کیے بغیر نہیں رہتی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ دعوت میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے، اور مولانا نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ سیرت ہی کا فیض ہے بلکہ اسوۂ نبوی ﷺ کی کرنیں ہیں جو مولانا کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔

مولانا نے بچپن سے سیرت کا مطالعہ کیا اور تدریسی دور میں ایک بڑا وقت ایسا گذرا ہے کہ مولانا سیرت میں ڈوب گئے، ہر وقت وہی فکر اور وہی مطالعہ اور وہی موضوع گفتگو، حدیث کی بڑی کتابوں کی تدریس میں مولانا کا خاص انداز تھا کہ جن روایات کا تعلق معاشرتی زندگی سے اور آپس کے روابط سے ہے ان میں مولانا دل کھول کر تشریح فرماتے تھے، جن روایات سے عام طور پر مدرسین تیزی سے گذر جاتے ہیں اور زیادہ تر ان روایات کا سر دہوتا ہے، مولانا ان کی باریکیوں میں جانے کی کوشش کرتے اور زندگی سے ان کا انطباق فرماتے، خاص طور پر مولانا نے ان سے وہ اصول اخذ کیے جس کی ساری زندگی انہوں نے دعوت دی، اور اپنی دعوتی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھایا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ کی زبان سے جو جملہ نکل گیا تھا اور اس کی شکایت آپ ﷺ سے کی گئی تو آپ ﷺ نے کس حکیمانہ طریقہ پر اس کی اصلاح فرمائی اس کو مولانا نے سیرت میں جس انداز سے کھولا ہے وہ ملاحظہ ہو:

> ''جب سعد بن عبادہؓ جو انصار کے دستہ کے امیر تھے، ابوسفیان کے پاس سے گذرے، انہوں نے کہا:
>
> "اليوم يوم الملحمة، اليوم تستحل الكعبة، اليوم أذل الله قريشا"
>
> (آج گھمسان کا رن ہے اور خونریزی کا دن ہے، آج کعبہ میں سب جائز ہوگا، آج اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے)

جب رسول اللہ ﷺ اپنے دستہ میں ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو انہوں نے آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی، اور کہا کہ یارسول اللہ! آپ نے سنا، سعد نے ابھی کیا کہا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا کہا ہے؟ انہوں نے وہ سب دہرادیا، سعد کے جملہ کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا اور فرمایا:

"الیوم یوم المرحمة، الیوم یعز اللّٰہ قریشا، ویعظم اللّٰہ الکعبة"

(نہیں، آج تو رحم ومعافی کا دن ہے، آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا اور کعبہ کی عظمت کو بڑھائے گا)

آپ ﷺ نے حضرت سعد کو بلوا بھیجا اور اسلامی پرچم ان سے لے کر ان کے صاحبزادے قیسؓ کے حوالہ کیا، آپ ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ ان کے صاحبزادے کو پرچم دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا پرچم ان سے واپس نہیں لیا گیا ہے۔

اس طرح ایک حرف کی تبدیلی (الملحمة کے بجائے المرحمة فرمادینے) اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تبدیل کردینے سے (جن میں سے ایک باپ کا ہاتھ تھا، دوسرا بیٹے کا) آپ ﷺ نے سعد بن عبادہ (جن کے ایمانی اور مجاہدانہ کارنامے اظہر من الشمس تھے) کی ادنی دل شکنی کے بغیر ابوسفیان کی (جن کو تالیف قلب کی ضرورت تھی) دل جوئی کا سامان ایسے حکیمانہ بلکہ معجزانہ طریقہ پر انجام دے دیا، جس سے بہتر طریقہ پر تصور میں آنا مشکل ہے، باپ کے بجائے ان کے بیٹے کو یہ منصب عطا کردیا، جس سے ابوسفیان کے زخم خوردہ دل کی تسکین منظور تھی، دوسری طرف آپ سعد بن عبادہ

کو بھی آزردہ خاطر نہیں دیکھنا چاہتے تھے، جنہوں نے اسلام کے لیے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔''(۱)

تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب-حضرات انبیاءؑ کی دعوتی زندگی میں

اس موضوع پر حضرت مولانا نے مؤثر محاضرات دیے تھے جو مستقل کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس میں حضرت مولانا نے قرآن مجید کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ ودعوت کے معجزانہ اسلوب کا نقشہ کھینچا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو کس طرح خطاب کیا ہے، قرآن مجید ان کی زبان میں اس کو بیان کرتا ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقاً نَّبِيّاً☆إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئاً☆ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطاً سَوِيّاً☆يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيّاً☆يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيّاً﴾ (مریم: ۴۱-۴۵)

(اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں؟ ابا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جیئے، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلادوں گا، ابا شیطان کی پرستش نہ کیجئے، بے شک شیطان خدا کا نافرمان ہے، ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں)

---

(۱) نبی رحمت: ۴۵۲-۴۵۳

حضرت مولانا ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان آیات میں حسب ذیل امور واضح طور پر نظر آئیں گے:

ا- پدرانہ شفقت کے جذبہ کو ابھارا گیا ہے:-

"یـــآبـــت" کے طرز خطاب پر غور کیجئے، میرے باپ (یا میرے ابا جان، میرے بابا، جس طرح بھی آپ ترجمہ کریں) اس انداز خطاب میں بیٹے کی سعادت مندی، محبت اور فروتنی پوری طرح نمایاں ہے، اس انداز خطاب کے لطف کو سمجھنا ذوق سلیم پر موقوف ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان سے آشنا کیا ہے، اور وہ اس کے لہجہ کی روح کو سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ ایسی آیت پڑھتے تھے جن میں عذاب الٰہی کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی آواز میں لرزش آجاتی تھی اور چہرہ ڈر سے سرخ ہو جاتا تھا، اور جب ان آیات کو پڑھتے جن میں اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت کا ذکر ہے تو ان کا دل پسیجتا اور آواز میں محبت کا سوز اور نرمی نمایاں ہوتی، جب ایک فرزند اپنے باپ کو میرے بابا یا میرے ابا جان کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ اس کے جذبہ شفقت پدری کو بیدار کرتا ہے، اگر داعیانہ تکبر کے ساتھ وہ کہتا: جناب والا سنئے! یا اے کاہن بزرگ! غور کیجئے!! (آذر، حضرت ابراہیم کے والد کاہن (معبد کے پروہت بھی تھے) تو اور ہی بات ہوتی، مگر وہ فرماتے ہیں:

"میرے ابا جان" (یـآبت) اور سمجھ بوجھ کر قصداً انہوں نے یہ انداز مخاطبت اختیار فرمایا تھا کہ ان کی بات دل کی گہرائیوں تک پہنچ جائے، اور پدرانہ محبت دل کے دروازے کھول دے، ایک باپ خواہ وہ جتنا بھی اپنے فرزند سے خفا ہو، لیکن جب وہ اس کو "میرے ابا

جان'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے، اور اس کی بات سننے کی طرف وہ مائل ہو جاتا ہے، حضرت ابراہیم نے اپنی دعوت میں جذبہ ایمانی سے پہلے شفقت پدری کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑا، اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات محبت ایمان سے پہلے دل میں گھر کرتی ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شفیق باپ تو ہو مگر مومن نہ ہو، اس کی شفقت کا سوتا جاری ہے، اور ایمان کا سوتا خشک ہے، لہٰذا اگر اس کو دعوت دینا ہے تو اس دروازے سے داخل ہونا ہوگا جو کھلا ہوا ہے، ایک داعی و مبلغ جسے ''حکمت'' کی نعمت ملی ہے، کبھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کرے گا تو خود اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچائے گا اور دعوت کو بھی، داعی و مبلغ اگر درشت مزاج ہو تو کامیاب نہیں ہو سکتا؛

﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(آل عمران: ۱۵۹)

(اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے)

نبی کریم ﷺ نے جب اپنے چچا ابو طالب کو مخاطب فرمایا اور ایک انتہائی نازک صورت حال کے موقع پر، تو خطاب اس طرح فرمایا: ''یا عـــم'' (چچا جان!) یہ وہ موقع ہے جب اسلام کے بارے میں ابو طالب گومگو کے عالم میں تھے، اور قریش کے مقاطعہ کا خوف ان پر طاری تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"یا عم! لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی أن أترك هذا الأمر حتی یظهره الله وأهلك دونه ما ترکته"

(چچا جان! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب بھی رکھ دیں اور کہیں کہ اس مہم سے باز آجاؤ تو بھی میں اس کو نہیں چھوڑ دوں گا اور اس وقت تک اس میں لگا رہوں گا تا آنکہ اللہ اس دین کو غالب کردے یا میں اس کے پیچھے اپنی جان قربان کردوں) اس نرم گفتاری (جو اپنے مسلک پر پختگی کے ساتھ تھی) کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابو طالب کا انسانی جذبہ ہمدردی اور شفقت ابھر آیا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آبائی دین پر قائم رہے مگر انہوں نے کہا: "یـــا ابـــن أخـــي" (اے میرے بھائی کے بیٹے) (لفظی ترجمہ تو یہی ہوا مگر اس لہجہ میں شفقت کا اثر ہے جیسے کوئی کہے میرے بیٹے! میرے بچے!) جیسے حضور اکرم ﷺ نے خطاب فرمایا تھا چچا جان! کہہ کر، اسی طرح جواب بھی میرے عزیز! یا میرے بیٹے کہہ کر ابو طالب نے دیا اور فرمایا:

"اذهب يا ابن أخي فقل ما أحببت فوالله ما أسلمك أبدا"(۱)

(میرے بیٹے! تم اپنا کام کرتے رہو اور جو جی چاہے کہو، میں اللہ کی قسم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کروں گا)(۲)

اصلاح یا انقلاب

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی کوششوں کا اصل محور اصلاح اور تغیر فکر تھا، مولانا انقلاب کے یقیناً داعی تھے مگر انقلابِ فکر اور اصلاح کے، وہ تبدیلی چاہتے تھے مگر تبدیلی اذہان کی نہ کہ ابدان کی، اور یہی انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا بھی مقصد نظر آتا ہے، مولانا انبیاء علیہم السلام کے اسی اسلوب دعوت کے قائل تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ نے فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾(طه: ٤٤) (اور

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۶۵-۲۶۶ (۲) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ۲۸-۳۱

اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا رقم طراز ہیں:

''اس ہدایت الٰہی کے بعد کسی داعی و مبلغ کے لیے اس امر کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ دعوت کے کام میں سخت کلامی یا لہجہ کی ترشی سے بات کرے اور اس کی کوئی بھی تاویل کر سکے، کیونکہ بے باکی، انکار، سرکشی میں فرعون سے سبقت وفوقیت لے جانے والے شخص کا تصور بھی مشکل ہے جو یہ کہے ﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى﴾ لیکن اس سے بھی بات کرنے کے لیے جب پیغمبر وقت کو بھیجا گیا تو یہ ہدایت کی گئی کہ نرم لہجہ میں بات کرنا۔''(۱)

دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ صحیح بات پہنچادی جائے اور دلوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اور اہل اقتدار کو اس پر آمادہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے کہ وہ حق کو اختیار کریں۔

حضرت مولانا نے دعوت کے یہ اصول ہر جگہ اپنائے، اپنوں میں بات کہی ہو یا غیروں میں، تحریکات کے مراکز ہوں یا مدارس، عوام ہوں یا خواص، یا اصحاب اقتدار، مولانا نے ہر جگہ اپنی بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے حکمت و مصلحت کے ساتھ پوری جرأت سے بات کہی، جو کہنا تھا سب کہا، لیکن الفاظ کی حرارت و برودت میں کبھی حد سے تجاوز نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کڑوی سے کڑوی بات انہوں نے کہی مگر وہ پوری اپنائیت کے ساتھ سنی گئی۔

ملوک و امراء، اور حکام و سلاطین کی دینی و فکری رہنمائی حضرت مولانا کی دعوتی زندگی کا ایک روشن باب ہے، انہوں نے ملاقاتوں کے ذریعہ سے ذہنوں کو صحیح رخ پر لانے کی کوششیں کیں اور مراسلات کے ذریعہ سے بھی ہدایات دیں اور اس کے مختلف ملکوں پر خاطر خواہ اثرات بھی مرتب ہوئے۔

---

(۱) تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب: ۷۰

عقیدہ وعمل کا فرق اور مولانا کا طرزِ تبلیغ

اہل اقتدار کی رہنمائی میں حضرت مولانا کے یہاں ایک فرق واضح طریقہ پر ملتا ہے، مسئلہ اگر عقیدہ وفکر کے انحراف کا ہوتا تھا تو حضرت مولانا بڑی قوت وجرأت کے ساتھ نکیر فرماتے تھے، مولانا یہ سمجھتے تھے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کا دائرہ محدود ہو بلکہ اس کے غلط اثرات دوررس ہوسکتے ہیں، اس لیے مولانا اس کا علاج ضروری سمجھتے تھے، اوراس کی ہلاکت آفرینی پر خاص وعام کو متوجہ فرماتے تھے، اوران خطرناک منافذ کی نشاندہی فرماتے تھے جہاں سے پوری ملت خطرہ میں پڑسکتی تھی۔

کمال اتاترک کے بارے میں حضرت مولانا نے سخت الفاظ لکھے اور کہے، اس کی وجہ اس کے عقیدہ وفکر کا وہ کھلا انحراف تھا جس کا حضرت مولانا نے تفصیل سے ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں تذکرہ کیا ہے، اور اس کے اسباب بھی بیان فرمائے ہیں، وہ کس قدر ملحدانہ نظریات رکھنے والا انسان تھا، عرفان اورگا کے حوالہ سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وہ شراب نوشی سے تسکین حاصل کرتا تھا اس لیے کہ روحانی تسکین کے لیے اس کے اندر نہ خدا کا اعتقاد تھا نہ زندگی کے بعد موت کا یقین، دوسروں پر ظلم کرکے خوشی حاصل کرنے کی جو فطری خصوصیت اس کے اندر تھی اس کا اظہار ہوا، وہ دوسروں کے جذبات کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا، اس لیے وہ کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا، اس کے اندر دوسروں کو مفتوح ومغلوب بنانے اوران کو اپنی مرضی کے سامنے سرنگوں کرنے کی فطری خواہش پائی جاتی تھی، وہ ہمیشہ چوٹی پر رہنا پسند کرتا تھا۔''(۱)

دوسری جگہ اس کی مذہب بیزاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> ''اس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس کی اصل جنگ

---

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش: ۴۰۷

مذہب کے خلاف ہے، بچپن سے اس کے نزدیک خدا کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ محض ایک پراسرار اور مغالطہ آمیز مجرد کا نام تھا، وہ صرف اس چیز پر یقین رکھتا تھا جو دیکھنے میں آسکتی تھی، اس کا خیال تھا کہ زمانۂ ماضی میں اسلام محض ایک تخریبی طاقت رہا ہے اور اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا۔'' (۱)

برسر اقتدار ہونے کے بعد اس نے ترکی کا رُخ پلٹ دیا، نظام خلافت کو ختم کر دیا گیا اور دین کو طاق پر رکھ دیا گیا، حضرت مولانا اس کی تفصیل کو اختصار کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

''کمال اتاترک نے واقعتاً قوم پر فتح پائی، ملک کو سیکولر (نامذہبی) اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا، جس میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں رہی، دین و سیاست میں تفریق ہوگئی، اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، ہر شخص اپنے لیے کسی مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ سیاست میں بھی اس کو دخل ہو، خلافت کے ادارہ کو ختم کر دیا گیا، شرعی اداروں اور محکموں اور اسلامی قانون شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے سوئزرلینڈ کا قانونِ دیوانی، اٹلی کا قانونِ فوجداری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا اور پرسنل لا کو یورپ کے قانونِ دیوانی کے مطابق و ماتحت کر دیا گیا، دینی تعلیم ممنوع قرار پائی، پردہ کو خلاف قانون قرار دیا گیا، مخلوط تعلیم کا نفاذ کیا گیا، عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری ہوئے، عربی میں اذان ممنوع قرار پائی، قوم کا لباس تبدیل ہوگیا، ہیٹ کا استعمال لازمی قرار پایا، غرض کہ کمال اتاترک

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش: ۷۵

نے سابق انگریز مؤرخ کے الفاظ میں ''ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو توڑ پھوڑ کے ختم کر دیا اور قوم کا نقطۂ نظر ہی بدل دیا۔''(۱)

اسی طرح قومیت عربیہ کے فتنہ کو حضرت مولانا پورے عالم عربی کے لیے ایک ناسور سمجھتے تھے، حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا قومیت و وطنیت کے بتوں پر کاری ضرب لگائی ہے، یہاں پر آکر مولانا کے قلم میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور نظر آتا ہے، اور کئی جگہ مولانا کے زبان و قلم سے ایسے سخت الفاظ نکل گئے جو کم کسی جگہ نکلے ہوں گے اور کیوں نہ ہو؟ جب حضور اقدس ﷺ کی زبان مبارک سے نسلی عصبیت کے بارہ میں منقول ہے کہ ''ایسی عصبیت کرنے والے کو کھل کر گالی دو، اور اشارے و کنایے سے کام نہ لو''۔

حضرت مولانا نے ہر طرح کی نسلی اور علاقائی گروہ بندی اور عصبیت کو دعوت اسلامی کے لیے ''زہر قاتل'' قرار دیا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ''اسلام کے آفاقی مزاج سے اس کا کوئی جوڑ نہیں''۔

صدر ناصر نے جب قومیت عربیہ کا صور پھونکا اور اس کو "نبي القومية العربية" لکھا جانے لگا، تو حضرت مولانا نے اس کے خلاف ایک جہاد چھیڑ دیا، مولانا نے محسوس کیا کہ ناصر عالم عربی کو ایک ہمہ گیر مادیت اور نامذہبیت کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، حضرت نے اس خطرہ کو جو پورے عالم عربی پر منڈلا رہا تھا، نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اس وقت اپنی زبان و بیان کی پوری طاقت اور زور تحریر کو صدر ناصر کی مخالفت و تنقید پر مرکوز کر دیا، اور ایسے کرب و اذیت اور قلب و ضمیر کے ایسے احتجاج و اضطراب کا اظہار فرمایا جو بہت سے لوگوں کے لیے باعث تعجب بھی تھا اور حیرت انگیز بھی، لیکن بقول حضرت کے واقعہ یہ تھا۔

دل عبث لب بہ شکوہ وانہ کند
شیشہ تانہ شکند صدا نہ کند

---

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش: ۸۱-۸۲

یہ حضرت کی بصیرت ایمانی، حقیقت شناسی کا نتیجہ تھا، اس کے علاوہ حضرت کے عالم عربی سے (جو عالم اسلام کے دل کی حیثیت رکھتا ہے) قلبی لگاؤ اور تعلق کا بھی اثر تھا، جب حضرتؒ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ عالم عربی کا اپنا مسئلہ ہے، مولانا کو اس سے کیوں اتنی دلچسپی ہے تو اس کے جواب میں حضرتؒ نے قلم برداشتہ ایک مضمون تحریر فرمایا جس میں عربوں سے اپنی گہری وابستگی ظاہر فرمائی، تحریر فرماتے ہیں:

''میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب و اسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک و بے وقت اس میدان میں آ گیا ہوں، میں اپنے کو ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی اس وسیع و عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میری تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان و ادب اور اس کی تہذیب و ثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر میرا حق کسی طہ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب و گل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور مجھے اقبال کے الفاظ

میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

میرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی (۱)

"البعث الاسلامی" نے (جو حضرتؒ کی سرپرستی میں حضرتؒ کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ نکالتے تھے) اس سلسلہ میں بہت اہم کردار ادا کیا، اور اس فتنہ کے خلاف ایک محاذ کھول دیا، اس کی گونج پورے عالم اسلام میں سنی گئی، مصری سفارت خانہ نے حکومت ہند سے اس کے بارے میں احتجاج بھی کیا، اور یہ خطرہ بھی ہوا کہ حضرت اور مولانا محمد الحسنیؒ کو اس سلسلہ میں زیادہ پریشانی اٹھانی پڑے، (اس سلسلہ میں حضرت کا پاسپورٹ بھی ضبط کیا گیا اور وزارت خارجہ کی طرف بلا کر باز پرس بھی کی گئی) لیکن یہ حضرات کلمہ حق بلند فرماتے رہے، حضرت کے اس طرز فکر اور طرز عمل نے اس فتنہ پر کاری ضرب لگائی، یہاں تک کہ خود علماء عرب نے اس کا اعتراف کیا، ایک مشہور عرب مجاہد ورہنما شیخ محمد محمود صواف نے کہا کہ

"البعث نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے نہ ہوسکا۔" (۲)

---

(۱) عالم عربی کا المیہ: ۱۵۹ (۲) پرانے چراغ: ۲/۳۹۵

اصحاب اقتدار اور مولانا کی اصلاحی کوششیں

جہاں حضرت مولانا نے محسوس کیا کہ مسئلہ فکر وعقیدہ کے انحراف کا نہیں، مسئلہ عملی کوتاہیوں کا ہے، وہ خواہ کتنی سخت کیوں نہ ہوں، مولانا نے ایسے اصحاب اقتدار کو حتی الامکان سمجھانے کی کوششیں کیں، ملاقاتوں کے ذریعہ اور مراسلات کے ذریعہ مولانا نے ان عملی کوتاہیوں کے خلاف خواہ کتنی شدید کیوں نہ ہوں، محاذ قائم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اصلاح وتنبیہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ذیل میں مختلف ملکوں میں حضرت مولانا کی ان مساعی کا ذکر کیا جاتا ہے، جو مولانا نے وہاں کے حکمراں طبقہ میں ملاقاتوں کے ذریعہ سے اور مراسلات کے ذریعہ سے کہیں۔

ان کوششوں میں دو پہلو بہت نمایاں نظر آتے ہیں، ایک اہل اقتدار تک پیغام حق پہنچانا اور دوسرے اس کے لیے بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا، مولانا کی ان ہی عملی کوششوں کی یہ تفصیلات ہیں جو مولانا کی تحریروں وتقریروں اور مجالس کی روشنی میں پیش کی جارہی ہیں۔

سعودی عرب

حضرت مولانا ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک دوسری پٹری پر پڑچکا تھا، حالات بدلنے شروع ہوگئے

تھے، حضرت مولانا نے ایک دردمند اور صاحب بصیرت داعی کی آنکھوں سے وہ سب دیکھا، ان کے دل پر اس کا اثر پڑا، سفر سے واپسی کے دن انہوں نے وہاں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ولی عہد مملکت امیر سعود کو ایک بصیرت افروز دردمندانہ اور ناصحانہ مکتوب تحریر فرمایا، یہیں سے طبقۂ حکام وامراء میں مولانا کی دعوتی کوششوں کا آغاز ہوتا ہے، مولانا نے اپنے پورے قیام میں جس استغناء کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیا اور جو مناسب اسلوب اس کے لیے اختیار کیا اس کے نتیجہ میں وہاں کے متعدد اصحاب فکر وعمل ان سے متاثر ہوئے، ان میں ایک نمایاں نام شیخ عمر بن حسن آل الشیخ کا ہے جو "هيئة الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر" کے رئیس تھے اور امیر سعود کے بڑے معتمد بھی تھے، یہ خط حضرت مولانا نے ان ہی کے ذریعہ سے امیر موصوف کو ارسال فرمایا، بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے خود یہ مکتوب امیر کو پڑھ کر سنایا۔

خط میں حضرت مولانا نے پہلے مملکت کی اہمیت وعظمت بیان فرمائی ہے، مسلمانوں کی اس سے جو توقعات ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے پھر اس غلط رخ کا ذکر فرمایا ہے جس پر عام طور سے حکومتیں پڑ جایا کرتی ہیں اور اس کی ضروری اور مناسب اصلاحات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

حضرت مولانا نے ۱۹۵۱ء میں حجاز مقدس کا دوسرا سفر کیا اور اس میں وہاں طویل قیام فرمایا، پہلے اور دوسرے سفر کے دوران تقریباً چار سال کا وقفہ ہے، اس وقفہ میں وہاں کے حالات تقریباً بدل چکے تھے، نئی تہذیب نے پوری طرح اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے، ہر اس چیز کی قیمت تھی جو "وہاں" سے درآمد کی جائے، نگاہیں اس تہذیب کی ملمع سازیوں سے خیرہ ہو رہی تھیں اور دل اس کی طرف مائل تھے، ان حالات سے حضرت مولانا کی حساس طبیعت اور دردمند دل پر ایک چوٹ پڑی۔

مولانا اس سے پہلے امیر سعود کو جو اب بادشاہ مملکت تھے ایک مکتوب کے ذریعہ سے ہدایات دے چکے تھے، اس لیے حضرت مولانا نے مناسب سمجھا کہ بجائے سلطان

کے ولی عہد مملکت سے ملاقات کر کے ان کو متوجہ کیا جائے، شاید وہ ان ہدایات پر سنجیدگی سے غور کریں، اتفاق سے انہیں دنوں امیر مدینہ منورہ تشریف لائے، مولانا نے ان سے تخلیہ میں گفتگو کی اجازت چاہی، انہوں نے فراخ دلی کے ساتھ موقع دیا، حضرت مولانا نے بنیادی طور پر ایک تحریر بھی تیار کر لی تھی جو ولی عہد موصوف نے ملاحظہ کی، پھر اسی کی روشنی میں حضرت مولانا نے گفتگو فرمائی اور ان خطرات سے آگاہ کیا جو مملکت کو درپیش تھے، امیر نے بہت سنجیدگی سے گفتگو سنی اور اس سے پورا اتفاق کیا، اللہ تعالیٰ نے امیر موصوف کو بہت کھلا ہوا ذہن اور وسیع دماغ دیا تھا، حضرت مولانا کی اس گفتگو سے ان کے دل میں فکر اسلامی کا بیج پڑ گیا جو بعد میں برگ و بار لایا۔

حضرت مولانا ہمیشہ تغیرات کا جائزہ لیتے اور ضرورت ہوتی تو حکام و سلاطین کو ہدایات دیتے، اسی طرح کی بعض نامناسب تبدیلیاں اور آزادانہ اقدامات کا جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے امیر فیصل ہی کو دوبارہ متوجہ کیا اور ایک بصیرت افروز مکتوب ان کو ارسال فرمایا، اس میں مملکت کی اہمیت و عظمت بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی کو خوشگوار اور آرام دہ بنانے والی چیزوں کو اپنانے اور مغرب کے پیچھے چلنے والی متمدن دنیا کی تقلید میں جدید ذرائع ابلاغ، آزاد و بے قید نشریاتی پروگراموں اور مغربی زندگی کے مظاہر کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے عوام کی بے چینی کا علاج ہوتا ہے اور وہ غلط ڈھنگ سے سوچنے سے بچ جاتے ہیں مگر مجھے معاف رکھا جائے کہ میں تاریخ اور تجزیہ کی روشنی میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا، میرے ناقص خیال میں یہ کوئی علاج نہیں، سمندر کا کھاری اور نمکین پانی تو پیاسے کو سیراب کرنے کے بجائے اس کی پیاس اور بڑھا دیتا ہے۔''(۱)

(۱) ایضا: ۳۵

ملک فیصل مرحوم علماء کے قدر شناس تھے، انہوں نے تجربہ کرلیا تھا کہ حضرت مولانا صرف اپنی دعوت پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ان کو اس سلسلہ میں نسبت نبوت حاصل ہے اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں: "وما أسئلكم عليه من أجر" (میں اس دعوت پر اجرت کا طلب گار نہیں) خطوط و ہدایات سے ان کے سامنے مولانا کی بصیرت اور دور اندیشی پوری طرح واضح ہو چکی تھی، اس لیے انہوں نے حضرت مولانا کی پوری قدر کی اور ان کی ہدایات سے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ ان کا ذہن فکر اسلامی کے سانچے میں ڈھلتا گیا، پھر جب ۳ر نومبر ۱۹۶۴ء میں ان کے ہاتھ میں زمام اقتدار آئی تو انہوں نے ممکن حد تک اس کی کوشش کی کہ مملکت کو عالم اسلام میں مرکزیت حاصل ہو، وہ جس وقت برسر اقتدار آئے وہ بڑے خطرات کا زمانہ تھا، دشمن ہر طرح کی اوچھی حرکت سے باز نہ آتے تھے، مگر شاہ فیصل نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان پر بھی قابو پالیا، اور مخالف منصوبوں اور کوششوں کو ناکام بنا کر عوام کا اعتماد حاصل کرلیا، اور دنیا نے ان کو خادم حرمین شریفین، اسلامی اتحاد کے علمبردار اور جملہ اسلامی مسائل کے ایک پر جوش اور صاحب ہوش حامی وداعی کی شکل میں دیکھا، انہوں نے "رابطہ عالم اسلامی" کو ایک فعال ادارہ بنایا، اور پورے عالم اسلام کو اس سے نفع پہنچا۔

شاہ فیصل مرحوم سے مولانا کو بڑی توقعات تھیں، ولی عہد کے دور سے لے کر شاہی تک ہر دور میں حضرت مولانا ان کو مشورے دیتے رہے اور متعدد خطوط لکھے (۱) ان کی بیدار مغزی، دینی فکر اور صلابت رائے سے امریکہ و یورپ میں بڑے خطرات محسوس کیے جانے لگے تھے، اور ان کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اگر یہ شخص زیادہ دنوں تک برسر اقتدار رہ گیا تو ان کا بنا بنایا سارا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا، یہ چیز ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، انہوں نے راستہ سے اس رکاوٹ کو ہٹانے کی کوشش کی، اور اسی خاندان کے ایک فرد کو اس کے لیے تیار کیا جس نے موقع پا کر اچانک شاہ کو شہید کر ڈالا، بعد میں مغربی میڈیا

(۱) اس کی تفصیلات کے لیے حضرت مولانا کی کتاب "حجاز مقدس - امیدوں اور اندیشوں کے درمیان" ملاحظہ ہو۔

نے یہ کہہ کر اس پر پردہ ڈال دیا کہ قاتل دماغی طور سے مفلوج تھا اور یہ کام اس نے پاگل پن میں انجام دیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو باقاعدہ ایک سازش کے طور پر تیار کیا گیا تھا کہ اسلام کا ایک قائد جس سے مسلمانوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں راستہ سے ہٹا دیا جائے اور امریکہ و یورپ سہولت کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

اس حادثہ کا حضرت مولانا کو بہت صدمہ ہوا اور برسوں کی دردمندانہ و مخلصانہ محنت و کوشش جو برگ و بار لانے لگی تھی اور اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے تھے اچانک مَلک کی شہادت سے اس پر گہرا اثر پڑا۔

شاہ فیصل مرحوم کے بعد شاہ خالد نے زمام سلطنت سنبھالی اور امیر فہد کو ولی عہد مقرر کیا، دولت کی فراوانی نے ملک کو جدید تمدن کے راستہ پر ڈال دیا تھا، مادیت کی لہریں اس کو اپنی گرفت میں لے رہی تھیں، اس کے نتیجہ میں اخلاقی بیماریاں بڑھنے لگی تھیں، مولانا اپنے ایک سفر میں ریاض تشریف لے گئے، اور شاہ خالد سے ملاقات کر کے ان کو بگڑتے ہوئے حالات سے آگاہ کیا اور اس کے انسداد کی تدبیریں بھی بیان فرمائیں، اور اس کے علاوہ امیر فہد کو جو اس وقت ولی عہد مملکت تھے ایک بصیرت افروز مکتوب تحریر فرمایا، اس میں شاہ فیصلؒ کی توجہ اور کوشش کا حوالہ بھی دیا اور ضروری اصلاحات کی طرف متوجہ بھی فرمایا، اور ملک کو درپیش خارجی خطرات کی نشاندہی کرنے کے بعد اندر موجود خطرات کی وضاحت بھی فرمائی، لیکن حضرت مولانا نے اپنے اسلوب دعوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، خط کے آغاز کے جملے ملاحظہ کریں:

> ''آپ کی عظیم ذمہ داریوں کے علم کے باوجود آپ سے ملنے اور پر سکون ماحول میں بات کرنے کا مشتاق تھا، اس کی جرأت مجھے اس عادت سے ہوئی جو آپ کے مرحوم بڑے بھائی شاہ فیصل نے ڈال دی تھی کہ میں جب بھی ان سے مخصوص گفتگو کا وقت مانگتا تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ وہ موقع فراہم کر دیتے اور صبر و سکون سے میری

باتیں سنتے اور مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔

میں نے اپنی معروضات کو تحریری شکل میں اس لیے پیش کرنا مناسب سمجھا کہ جناب اس طرف توجہ فرمائیں گے، اگر چہ خط دلوں کی باہمی گفتگو اور آنکھوں سے اظہار غم کا بدل نہیں بن سکتا، اللہ سے امید ہے کہ وہ دوسری ملاقات کا موقع بھی دے گا، مجھے امید ہے کہ آپ اس صاف گوئی کی بھی اجازت دیں گے، جو میں مرحوم شاہ فیصل کے نام خطوط اور گفتگوؤں میں برتتا رہا ہوں، اور جس کا باعث ان بلاد مقدسہ اور شاہی خاندان سے خلوص ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین اور اسلام کی خدمت کے لیے چنا ہے، یہ ملک اور امت اسلامیہ جن حالات سے دوچار ہے ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔''(۱)

پھر اصل مقصد کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

''.....رہا داخلی خطرہ تو میرے نزدیک پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، امیر معظم! صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ملک اس وقت تیزی سے خودکشی کے راستہ پر جارہا ہے اور قوم کو دو طوفانی موجیں گھیرے ہوئے ہیں، ایک موج مال کی ہوس، اس میں اضافہ کی حرص، جائز و ناجائز ہر طریقہ سے اس کے حصول کی کوشش ہے، جس کے سبب تمام دینی و اخلاقی قدریں، احترام انسانی اور عالم اسلام سے آنے والوں اور یہاں بسنے والوں کے مفاد بھلا دیئے گئے ہیں، اس رجحان کو ہم مادیت اور ہوس کی ''ہسٹریا'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس کے سبب عجیب و غریب اور پیچیدہ مشکلات سامنے آرہی ہیں۔

دوسری سرکش موج آرام طلبی و تفریح کا حد سے بڑھا ہوا شوق و شغف

(۱) ایضاً: ۴۹-۵۰

ہے، ملک اس وقت نغمہ وموسیقی اور لہو ولعب کے سیلاب میں تیر رہا ہے، اور ہر قسم کی سخت کوشی و جفاکشی اور صبر وضبط سے فرار اختیار کرنے کے موڈ میں ہے، اور اسی کے سبب وہ عرب مسلم قوم (جو تاریخ میں جفاکشی، سادگی اور فروسیت، (شہ سواری) کے لیے مشہور عالم رہی ہے اور جس کے ذریعہ اسلام کی امانت کی حامل رہ کر اس نے دنیا کی متمدن مریض قوموں پر غلبہ پایا تھا) مردانگی اور بہادری کے تمام اوصاف سے خالی ہوتی جارہی ہے، اور اگر کچھ دنوں یہی حال رہا تو ایک ایسی نازک نسوانیت کی حامل نسل آئے گی جو کسی بھی خارجی یا داخلی چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور ملک کی سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گی، چہ جائے کہ وہ اسلامی دعوت کی تبلیغ کرے اور عالم اسلام سے آنے والے حجاج کے لیے صالح نمونہ اور رہنما بنے۔''(۱)

دوسرے مذاہب کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور اس کے نتائج وخطرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''فیصلہ الٰہی تو یہ تھا اور ہے کہ جزیرۃ العرب اسلام کا حرم اور پناہ گاہ بنے اور اخیر وقت میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں'' اور فرمایا کہ ''جزیرۃ العرب سے یہود ونصاریٰ کو نکال دو'' اس جزیرہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد لفظی مطلب کے علاوہ اپنے اندر بڑے دور رس معانی رکھتا ہے، وہ ان کے اثرات، ان کی ثقافت واقدار سے بھی اس جزیرہ کو پاک رکھنے کا اشارہ کر رہا ہے، اور اس خطرہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ کوئی ایسی نسل نہ پیدا ہو جائے جس کے اور حرم و مسجد رسول کے درمیان کوئی ہم آہنگی، مفاہمت واتفاق نہ ہو، یہ ایسا

(۱) ایضا: ۵۱-۵۲

خطرہ ہے جس کی گذشتہ تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی اور اس کا وجود (اللہ وہ دن نہ لائے) اس ملک کی عزت وسلامتی کے لیے بڑا ہی منحوس ہے اور غیرت الٰہی کو جوش میں لاسکتا ہے جیسا کہ تاریخ میں بارہا ہوا ہے۔''(۱)

یہ مکتوب ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا اس کے بعد بھی حالات کا جائزہ لیتے رہے، سال میں دو تین مرتبہ حجاز کا سفر ہوتا اور کئی کئی ہفتے وہاں قیام کی نوبت آتی، ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں، مولانا نے اندازہ کرلیا کہ اب بھی گاڑی غلط رخ کی طرف جارہی ہے اور ملک ومعاشرہ کا رخ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے، حضرت مولانا نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ باقاعدہ اعداد وشمار کے ساتھ ایک ریکارڈ تیار کرکے اس کی روشنی میں صاف صاف وہاں کے ذمہ داروں کو آگاہی دی جائے، اس کے لیے حضرت مولانا نے ایک مفصل مضمون تیار فرمایا جو خود اپنی جگہ صاحب مضمون کی بصیرت وفراست، دور بینی، بالغ نظری، اور وسعت مطالعہ کا غماز ہے، یہ مضمون فل اسکیپ کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بڑی بلاغت اور حکمت دعوت کے ساتھ وہاں کے اعلیٰ عہدیداروں اور ذمہ داران حکومت خاص طور پر شاہ اور ولی عہد کو خطاب کیا گیا ہے۔

مکتوب میں حضرت مولانا نے پہلے حجاز مقدس کی اہمیت وعظمت، اہل ایمان کا اس سے تعلق وارتباط اور خود اپنی قلبی کیفیت کا ذکر فرمایا ہے، پھر سعودی حکومت کی خوبیوں کا اعتراف بھی فرمایا ہے، اس کے بعد اصل موضوع کو چھیڑا ہے، اس میں حضرت مولانا نے چھ نکات کی طرف خاص توجہ دلائی ہے اور اعداد وشمار کے ساتھ تفصیل سے ترتیب واران کو بیان فرمایا ہے:

۱- ذرائع ابلاغ (Public Media) ۲- فلمیں اور ملک میں پھیلے ہوئے

(۱) ایضا: ۵۳-۵۴

کیسٹ، ۳-صحافت، ۴-تعلیم، ۵-کھیل کا جنون کی حد تک پہنچا ہوا شوق اور حکومت کی سرپرستی، ۶-معیار زندگی کی بلندی، ۷-سامان تعیش کی فراوانی اور تفریحی رجحان۔

ان تمام نکات پر حضرت مولانا نے حقائق و واقعات، روزمرہ کے مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے دو دو چار کی طرح گرفت کی ہے، اور ان کے لیے مناسب اور ضروری اصلاحات کا ذکر فرمایا ہے۔

یہ تحریر "أين تتجه الجزيرة العربية وإلى أي غاية تنتهي" (جزیرۃ العرب کس طرف جارہا ہے اور کہاں جاکر رکے گا) کے عنوان سے مرتب کی گئی اور مکتوب کی شکل میں ذمہ داروں کو بھیجی گئی، شاہ خالد کو یہ مکتوب شیخ بن باز اور شیخ عبداللہ بن حمید کے ذریعہ پہنچایا گیا، اور شاہ نے اس کا مطالعہ کیا، اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد شاہ کی وفات ہوگئی اور ملک فہد ان کے جانشین قرار پائے۔

ملک فہد کے زمانے میں کویت پر عراق نے حملہ کیا جو امریکہ کے سازشی ذہن کا ایک حصہ تھا، اس کے نتیجہ میں امریکہ کو موقع مل گیا کہ وہ سعودی عرب اور کویت میں اپنی فوجیں اتار دے، پوری عرب دنیا کے لیے یہ بڑی شرمناک صورت حال تھی، اس کے بعد بھی جب حضرت مولانا نے سعودی عرب کے سفروں میں وہاں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی اور دیکھا اس طرح لوگ لذات دنیوی میں منہمک ہیں، حلال وحرام کا فرق اٹھتا جارہا ہے اور حالات میں بجائے بہتر تبدیلی پیدا ہونے کے وہ غلط رخ کی طرف جارہے ہیں، امریکی تہذیب اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ حاوی ہوتی چلی جارہی ہے تو مولانا نے فرماں روائے مملکت سعودیہ شاہ فہد بن عبدالعزیز کو اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ آگاہ کیا، وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے ان کو اخلاص، انابت الی اللہ اور امکانی حد تک مملکت اور معاشرہ کو مثالی اور معیاری بنانے کی طرف متوجہ کیا، اپنے درد دل کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اگر ممکن ہوتا تو راقم سطور اپنے مضطرب و بے تاب دل اور درد و

کرب سے متاثر دماغ کو اس مخلصانہ عریضہ کے صفحات پر نکال کر رکھ دیتا، اگر روشنائی کے بجائے خون جگر اور آنسوؤں سے یہ تحریر رقم کی جا سکتی تو اس میں بھی دریغ نہ کرتا۔''(۱)

عمومی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس وقت عالم اسلام عموماً اور جزیرۃ العرب اور بلاد مقدسہ خصوصاً ایسے سنگین اور فیصلہ کن مرحلہ سے گذر رہے ہیں جس کا مقابلہ کرنے اور اس کے ازالہ کی کوشش میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی گنجائش نہیں اور نہ کسی امکانی جدوجہد سے گریز ممکن ہے۔''(۲)

اس کے بعد دو چیزوں کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی اور فرمایا :

''اس وقت تمام اسلامی ملکوں میں دو ایسے خلاء ہیں جن کو پر کرنا فوری طور پر ضروری ہے، ایک خلاء ہے مثالی معاشرہ کے فقدان کا جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو اور عقائد و اخلاق سے لے کر معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں وہ اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہو، انسان اس فضا اور ماحول میں امن وسکون اور طمانیت قلبی محسوس کرے، ایمانی خوشبو اس کے مشام جاں کو معطر کردے۔''(۳)

''عالم اسلامی کا دوسرا خلاء کسی ایسی طاقتور اور مومنانہ دعوت وقیادت کا فقدان ہے جس کے اندر مردانگی کا جوہر، بلند نگاہی، عالی ہمتی، دور اندیشی اور پیش بینی کے ساتھ ان بڑی طاقتوں کو سامنا کرنے کی صلاحیت اور قدرت بھی ہو جنہوں نے بغیر کسی جواز و استحقاق کے نوع انسانی کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے اور جو اسلامی ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کی مالک بن بیٹھی ہیں۔''(۴)

---

(۱) کاروان زندگی:۲/۲۲ (۲) ایضا:۵/۲۳ (۳) ایضا:۵/۲۶ (۴) ایضا:۵/۲۶

ان خطوط سے جہاں حضرت مولانا کی فکرمندی اور درد وسوز کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کی بصیرت اور فہم وفراست بھی نظر آتی ہے، اور دعوت کا اسلوب ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی اس دعوت وفکر کا محور حجاز مقدس کو بنایا تھا جو کل عالم اسلام کا دل ہے، وہ جانتے تھے اگر اس کی اصلاح ہوگئی اور نظام درست ہوگیا تو بقیہ ممالک میں اس کے اثرات ضرور اپنا کام کریں گے، ان کی اس کوشش کا سب سے بڑا نتیجہ شاہ فیصل مرحوم کی شکل میں ظاہر ہوا تھا، مرحوم نے اتحاد اسلامی کے علمبردار کی حیثیت سے بڑی خدمات انجام دیں، اور اس کے نتائج ظہور پذیر ہونے لگے تھے، لیکن اچانک ان کی شہادت کی وجہ سے اس فکر و دعوت پر ضرب لگی، حضرت مولاناؒ کو اس سے طبعاً صدمہ پہنچا، لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے اور ان کے بعد آنے والے حکمرانوں کے سامنے مسلسل اپنی دعوت پیش کرتے رہے، سعودی عرب کے علاوہ بھی جس ملک میں تشریف لے جاتے وہاں اس طبقہ کو خاص طور سے متاثر کرنے کی کوشش فرماتے جس کے ہاتھ میں زمام کار ہے۔

کویت

۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ مولانا کویت تشریف لے گئے، وہاں کے امیر شیخ عبداللہ سالم سے بھی ملاقات کی اور ضروری مشورے دیئے، اس کے علاوہ تحریری یادداشت بھی ان کے سپرد کی جس میں وہ اسلوب دعوت صاف جھلکتا ہے جو حضرت مولانا کا امتیاز تھا، پہلے اعتراف وتحسین ہے پھر حقائق کا اظہار ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں آپ کو وہ نادر موقع دیا ہے جس میں آپ اپنا انقلابی رول ادا کر سکتے ہیں، جو ہمیشہ شکر واعتراف کے ساتھ یاد رکھا جائے گا، وہ رول ہماری موجودہ تہذیب کے خلا کو پر کرنا ہے؛ وہ خلا کسی ایسی حکومت کا نہ ہونا ہے جو دین وعقیدہ اور مادی وسائل و ذرائع کے درمیان ربط پیدا کرے، وہ خلا ایسے معاشرہ کا فقدان ہے

جس میں ایمان واخلاق اور معاصر دنیا کے جدید تجربات کے درمیان ہم آہنگی ہو، یہ ایسا خلا ہے جسے دنیا کی کوئی بڑی حکومت بھی نہیں بھر سکتی، جو حکومت بھی اس شعار کو اپنائے گی وہ حکومتوں کی صف میں معنوی لحاظ سے اپنا اولین مقام بنالے گی اور اس کو ایسا وقار واحترام حاصل ہوگا جو دنیا کے بڑے ملکوں کو بھی حاصل نہیں۔

یہ نصرت الٰہی، تائید غیبی، برکات اور عوامی مقبولیت کے علاوہ ہے جس کا اللہ نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ فرمایا ہے، جو اس دین کے وارث اور اس پیغام کے حامل اور اس راستہ کے مجاہد ہوں گے۔

اس مقصد کی تکمیل کے وسائل بحمد اللہ بہت ہیں اور اس کا موقع بھی میسر ہے، بشرطیکہ ارادے نیک اور عزم مستحکم ہو: "إن تنصروا الله ينصركم و يثبت أقدامكم".

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ یہ طے فرمادیا تھا کہ عربوں کی ترقی، وحدت وقیادت اور ان کی مشکلات کا حل اس دین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ ہی سے ممکن ہے، تاریخ اس کی گواہ اور تازہ واقعات اس کی دلیل ہیں، چنانچہ جو بھی عربوں کے رشتہ کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے کمزور کرنا چاہے گا یا انھیں ان سے الگ کر کے ایک قوم کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کرے گا وہ عرب قوم پر سب سے بڑا ظلم کرے گا، وہ اس کے دل سے ایمان کی جڑ کھود پھینکنا، اس کے عقیدہ کو کمزور کرنا اور مخلصین و مصلحین اور امت عربیہ کی صدیوں کی تعمیر کو برباد کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ کسی بھی عرب مملکت کی ہمت افزائی کا مستحق نہیں، وہ ان کا سب سے بڑا دشمن ہے، جو ان کا تعلق ماضی اور حال کی وسیع دنیائے اسلام

سے کاٹ دینا چاہتا اور اس سرچشمہ کو خشک کر دینا چاہتا ہے۔''(۱)

اخیر میں ایک بڑے خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آخری بات جس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کا مسئلہ ہے، آپ کو معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے جزیرۃ العرب کو اسلام، مسلمانوں اور خدا کی خالص توحید و عبادت کے لیے مخصوص فرمایا، امیر المومنین حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ''جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو بھی نکال دوں گا اور مسلمانوں کے سوا وہاں کسی اور کو رہنے کی اجازت نہیں دوں گا'' اور سفر آخرت کے وقت فرمایا: ''لا یبقین دینان علی أرض العرب'' (سرزمین عرب میں دو دین ہرگز نہ رہیں) اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت تھی کہ ''جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں'' ان غیر اسلامی معابد سے ملک کی سالمیت کو اس لیے خطرہ ہے کہ ان کے متولی ان کی حمایت کا مطالبہ کریں گے اور ان کے وجود سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور اس سے ایسے عقدے پیدا ہوں گے جن کا حل ممکن نہ ہوگا، اس طرح اجنبی اقلیتوں، ان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور آراضی کی ملکیت کے بارے میں بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جس کے سبب ''ریاست اندرون ریاست'' پیدا ہونے اور لاینحل مشکلات کے ابھرنے کا خطرہ ہے۔''(۲)

اس خط سے بھی حضرت مولانا کی فراست و بصیرت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے جس چیز کا اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ آج ایک حقیقت اور واقعہ کی شکل میں سامنے ہے۔

---

(۱) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب: ۹۲-۹۳ (۲) ایضا: ۹۴-۹۵

شرق اردن

۱۹۵۱ء میں شرق اردن کے سفر میں شاہ عبداللہ والی اردن سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی، اس موقع پر حضرت مولانا نے ان کو خاص طور سے مسئلہ فلسطین کی طرف توجہ دلائی، مسجد اقصیٰ کی تولیت کی نازک ذمہ داری کا احساس دلایا اور پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کے لیے متوجہ کیا، اس سفر میں مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی ہمراہ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ ''مولانا علی میاں نے شاہ سے کہا کہ جلالۃ الملک! اگر چھوٹے سے چھوٹا ملک ہو اور خواہ اس کی پیداوار کم ہو، اس کی فوج بھی ناقابل ذکر ہو، لیکن اسلام کو اپنالے اور دین کے احکام اپنی مملکت میں رائج کرلے تو وہ دنیا کے لیے رحمت بن سکتا ہے، اور ساری دنیا کے لیے نمونہ بن سکتا ہے، جب مولانا بات کررہے تھے تو میں نے شاہ کو دیکھا کہ وہ کنکھیوں سے اپنے ایک وزیر کو دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں: سنو! ایک ہندی داعی دین کیا کہہ رہا ہے؟''

مولانا عبداللہ عباس صاحب ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''شاہ نے ان کو ایک ہدیہ بھی پیش کیا تھا، جس کو مولانا نے فلسطین فنڈ میں دے دیا، کیونکہ شاہ کا ہدیہ واپس کرنا آداب شاہی کی توہین شمار ہوتا ہے، مگر جس فنڈ میں چندہ دیا اس کے صدر خود بادشاہ تھے۔''(۱)

اس کے بائیس سال کے بعد حضرت مولانا جب دوبارہ شرق اردن تشریف لے گئے تو حالات بدل چکے تھے، شاہ حسین ملک عبداللہ کے پوتے تخت نشین تھے، حضرت مولانا اس دورہ میں ''رابطہ عالم اسلامی'' کے وفد کی قیادت فرمارہے تھے، شاہ حسین نے وفد کی دعوت کی اور حضرت مولانا نے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک کے سامنے بڑی پرجوش اور مدلل تقریر کی، اور شاہ حسین کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو فلسطینی پناہ گزینوں کے بارے میں ان پر عائد ہوتی ہے، انہوں نے فرمایا:

---

(۱) میر کارواں: ۳۰۱-۳۰۲

''یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ فلسطینیوں کو عیسائی مبلغین اور رفیوجی ریلیف کمیٹیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی زبوں حالی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں''۔(۱)

مزید فرماتے ہیں:

''یہ عظیم ترین ذمہ داری ہے دنیا میں بھی، آخرت میں بھی، ہم سب ایک روز اللہ کے حضور کھڑے کیے جائیں گے اور ان مصیبت زدہ اور قابل رحم لوگوں کے بارے میں ہم سے باز پرس ہوگی جو اپنے وطن سے صرف اس بنا پر نکالے گئے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے۔''(۲)

شاہ نے حضرت مولانا کے ساتھ بڑے احترام وعقیدت کا معاملہ کیا، خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور رخصت کرنے کے لیے کچھ دور چل کر آئے۔

اس سفر کے بعد کئی سال تک شرق اردن کا سفر نہیں ہوسکا، اگرچہ وہاں کے ولی عہد امیر حسن بن طلال حضرت مولانا سے خاص تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے متعدد مرتبہ دعوت دی، لیکن ۱۹۸۴ء میں سفر کی نوبت آئی، یہ سفر ''مؤسسة آل البیت'' کی دعوت پر ہوا تھا، امیر حسن اس ادارہ کے سرپرست تھے۔

افتتاحی پروگرام میں وہ شریک ہوئے اور خاص طور پر حضرت مولانا کا انہوں نے شکریہ ادا کیا، ۲۷/ رجب کے افتتاحی پروگرام کا خاص موضوع مسئلہ فلسطین تھا، اس میں امیر حسن نے اپنے اعداد وشمار سامنے رکھ کر پرمغز تقریر کی اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، امیر موصوف کی تقریر کے بعد حضرت مولانا کی تقریر ہوئی جس میں نے انہوں نے ایمان کی اصل طاقت کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی ضرورت پر زور دیا، مولانا نے فرمایا:

''انسانی بالخصوص اسلامی تاریخ کی متواتر شہادتیں ہیں کہ اصل فیصلہ

---

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک: ۲۲۴ (۲) ایضا: ۲۲۴

کن چیز، ملتوں اور قوموں کی تقدیر کو بدلنے والی حقیقت، ممالک کا سیاسی اور جنگی نقشہ یکسر تبدیل کردینے والی طاقت، اعداد وشمار، قلت وکثرت کا تناسب اور تسلیم شدہ صورت حال نہیں ہوتی، اصل انقلاب انگیز طاقت اور ناممکن کو ممکن بنانے والی چیز اس ہستی کا وجود ہے جو عزم وایمان کی خارق عادت طاقت سے سرشار، صورت حال کو یکسر بدل دینے کے لیے ہمہ تن تیار اور اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی و جاں نثاری، خطر پسندی، مہم جوئی کے لیے مضطرب و بے قرار ہو، تاریخ کی شہادت ہے کہ اس موقع پر یہ ٹھوس اعداد وشمار اور مشکلات و مخالفتوں کے پہاڑ برف اور موم کی طرح پگھل کر پانی ہوجاتے ہیں، اور فتح کا آفتاب رات کے اندھیرے اور سردی کے کہرے کو چیرتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے، یہی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی سرگزشت اور جنگ صلیبی کی تاریخ کا خلاصہ ہے، اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف
صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ نکتہ فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف''(۱)

امیر حسن کی اعداد وشمار پر مشتمل تقریر کے بعد جس سے کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی، اس تقریر نے دلوں میں جوش ودولولہ پیدا کردیا، خود امیر موصوف پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

اس سفر کے بعد عرصہ تک حضرت مولانا اردن تشریف نہیں لے جاسکے، اگست ۱۹۹۸ء میں عمان میں ''عالمی رابطہ ادب اسلامی'' کی مجلس امناء کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں حضرت مولانا بحیثیت صدر رابطہ تشریف لے گئے، ایرپورٹ پر خلاف معمول

(۱) کاروان زندگی: ۳/۱۸

بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، پاکستان سے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر بھی تشریف لائے تھے، وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عالم عرب میں ہر جگہ جانے پہچانے مفکر اسلام اور عربی داں کو اتنی دیر ہوائی اڈہ پر بٹھائے رکھنا اور وہ بھی اس ضعیف العمری اور کمزور صحت کے ساتھ، انتہائی سنگدلی اور بے دانشی تھی، مگر بایں ہمہ مولانا کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا، لوگ اس جفا کاری کے شکوے کر رہے تھے اور مولانا مسکرا مسکرا کر سنتے جا رہے تھے، بدسلوکی کرنے والوں کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، وہ حقیقت میں سلف صالح کی زندہ نشانی تھے، اور پتھر کھا کر دعائیں دینے والی ہستی کے آل واولاد ہونے کا عملی ثبوت دے رہے تھے، مگر جب صبح ہوئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، شہزادہ حسن نے اس سخت گیر وزیر اعظم کی کابینہ ہی برخواست کر دی تھی اور راتوں رات نئی کابینہ نے حلف اٹھالیا تھا، سویرے سویرے اوقاف اور اسلامی امور کے نئے وزیر صاحب حاضر ہوئے اور کہا کہ مولانا اور ان کے ساتھ مجلس امناء کے تمام ارکان سرکار کے مہمان ہیں اور اسی وقت پانچ ستاری ہوٹل میں منتقل ہو جائیں مگر مولانا کی طرف سے شکریہ کے ساتھ جواب دیا گیا کہ درویش اپنی درویشی میں خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔''(۱)

یہ وہ زمانہ تھا کہ زمام اقتدار امیر حسن کے ہاتھ میں تھی اور ملک حسین مرض الموت میں گرفتار تھے، علاج کے لیے امریکہ گئے ہوئے تھے، امیر موصوف عرصہ سے حضرت مولانا کے عقیدت مند تھے، دوسرے دن انہوں نے سرکاری سطح پر حضرت مولانا اور ان کے رفقاء کی دعوت کی جس میں وزیر اعظم سمیت پوری کابینہ کو بھی مدعو کیا، کھانے کے ساتھ اس میں باقاعدہ مذاکرات کی نشست بھی ہوئی، نئے وزراء اور پھر

(۱) مجلہ قافلہ ادب اسلامی (پاکستان): ۱/۱۴۹

امیر حسن نے فاضلانہ تقریریں کیں، اخیر میں حضرت مولانا کو خطاب کی دعوت دی گئی، حضرت مولانا نے فرمایا:

''بڑی مدت کے بعد زعمائے عرب کی ایک چیدہ جماعت سے مخاطب ہوں، آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ عرب اسلام سے پہلے بھی کچھ نہ تھے، اور اسلام کے بغیر بھی کبھی کچھ نہ ہوں گے، ریگستان میں بھٹک رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک بندہ کو حق کے غیر فانی پیغام کے لیے چن لیا، کتاب اللہ کے معارف نے ایک پسماندہ اور نور علم وتمدن سے محروم قوم کو علوم و معارف کا مالک بنادیا، روم و ایران جن خانہ بدوشوں کو چرواہوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے وہ نہ صرف ان کے سامنے سرنگوں ہوگئے اور اقتدار اور دولت کی چابیاں ان کے سپرد کردیں، بلکہ ان کے پیروکار اور خوشہ چیں بن گئے، آج پھر ایک مرتبہ وہی صورت پیدا ہورہی ہے، تاریخ خود کو دہرارہی ہے، حرص کے جبڑے پھاڑے لوگ اسی عرب قوم کو اس کی روحانی و مادی دولت دونوں سے محروم کر کے پھر صحرا میں بھٹکنے کے لیے پھینک دینا چاہتے ہیں۔

کل بھی تمہیں عزت و طاقت اسلام نے دی تھی اور آج بھی تمہاری عزت و طاقت کا حقیقی سرچشمہ اسلام ہی ہے، یہ میں نہیں کہتا بلکہ یہ تو امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمایا ہوا ہے، عرب قومیت نے نہ تمہیں پہلے کچھ دیا ہے، اور نہ پھر کچھ دے سکے گی۔''(۱)

ڈاکٹر ظہور احمد صاحب جو اس مجلس میں شریک تھے لکھتے ہیں:

''تھوڑی دیر کے لیے میں بالکل بھول گیا کہ ہم کسی شاہ کے دربار میں ہیں، سب خاموشی سے مولانا کی باتیں سن رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے تو سب کی زبانیں سراپا تحسین ہوگئیں اور امیر موصوف

(۱) ایضا: ۱/۱۵۱-۱۵۲

نے اس تقریر سے خاص اثر لیا۔"(۱)

ولی عہد کا حضرت مولانا سے تعلق بڑھتا گیا، انہوں نے حضرت مولانا کی تصنیفات سے بھی فائدہ اٹھایا، اس سے ان کی فکر ور جحان میں بہتر تبدیلی پیدا ہوئی اور یہ امید ہو چلی کہ وہ برسر اقتدار آنے کے بعد بہتر اصلاحی اقدامات کریں گے، لیکن شاہ حسین نے اپنے مرض وفات میں اچانک ان کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے فرزند کو ولی عہد مقرر کر دیا "و کان امر اللّٰہ قدراً مقدورا"

مراکش

۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا "رابطة الجامعات الاسلامية" کی دعوت پر مراکش تشریف لے گئے۔ وہاں دو ہفتہ کے قیام کے آخری دنوں میں شاہ حسن ثانی شاہ مراکش کی جانب سے دعوت کا اہتمام کیا گیا، حضرت مولانا کو وہ پہلے بھی مراکش آنے کی دعوت دے چکے تھے، مگر اس وقت حضرت مولانا نے معذرت فرمائی تھی، اب اس سفر میں ان سے ملاقات اور گفتگو کی نوبت آئی، مہمانوں کی طرف سے حضرت مولانا نے ہی ان سے خطاب کیا، خطاب کا آغاز جس انداز سے فرمایا ہے اور دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے وہ مولانا کی حکمت و دعوت کا ایک حصہ ہے:

> "آپ کو عالم اسلام کی جانب سے ایک بہت عزیز پیغام پہنچانے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج دنیا کے مسلمان بے چینی سے اس کے منتظر ہیں کہ عالم اسلام کے افق سے کوئی نیا ستارہ طلوع ہو، مسلمان اس وقت ایسے غیر معمولی حالات سے گذر رہے ہیں جن میں کوئی غیر معمولی قائدانہ شخصیت ہی ان کی مشکل کشائی کر سکتی ہے، جو غیر معمولی قوت ایمانی، عزم راسخ، اور اخلاص کامل سے متصف ہو، اور جو سیاسی اغراض و مفادات سے بلند ہو کر رضائے الٰہی اور خدمت

(۱) ایضا: ۱/۱۵۱-۱۵۲

اسلام کا عہد کرے، اس کے لیے آپ کے والد نامدار سلطان محمد الخامس پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگی تھیں، لیکن ان کو جلد پیغام رحیل آ گیا، کیا عجب اللہ تعالیٰ آپ سے یہ کام لینا چاہتا ہو!۔''(۱)

مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہم اس ملاقات کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

''اجلاس کے اختتام پر شاہ مراکش سے ملاقات کا موقع ملا، مولانا نے مہذب اور شائستہ انداز میں لیکن پرجوش اور مؤثر خطابت کے اسلوب میں ملک کی اخلاقی ضرورت اور دینی حالت اور عصری تقاضوں کی رعایت اور اس میں اخلاص عمل کی طرف صاف طریقہ سے توجہ دلائی، موقع بہت نازک تھا، بادشاہ کی ملاقات کے لیے سب شرکائے کانفرنس آئے تھے اور موضوع صرف ملاقات کا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو سب کی طرف سے بولنے کا موقع دیا گیا جو عام طور پر صرف تہنیت اور شکریہ کا موقع سمجھا جاتا ہے، جس کا ایک الگ مہذب طریقہ ہوتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی رعایت رکھی اور اپنی پوری بے باکانہ رائے کا اظہار کیا، اس میں وہ باتیں بھی تھیں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ملک کے حالات کے تناظر میں بتائی گئی تھیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بہت کامیاب تقریر سمجھی گئی۔

اس کے بعد ایک بہت بڑے عرب عالم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی کچھ بولیں گے چنانچہ ان کو موقع دیا گیا، وہ اہل زبان ہونے کے باوجود موقع کی نزاکت اور ضرورت کا پورا لحاظ نہ کر سکے بعد میں ارکان نے جو تقریباً سب علماء اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے اپنے تبصروں

(۱) کاروان زندگی: ۲/ ۲۳۷-۲۳۸

میں مولانا کی کامیاب تقریر اور ان عرب عالم کی کمزوری کا تذکرہ کیا، میں اس موقع پر موجود تھا، مولانا کی عربی زبان میں وہ عالمانہ اور مبصرانہ ترجمانی تھی کہ مجھے بھی حیرت ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی مدد کا نتیجہ ہے جو مولانا کے اخلاص اور داعیانہ جذبہ کی وجہ سے ان کو حاصل ہوا اور مجھے اس طرح کے دوسرے متعدد موقعوں پر بھی یہ بات محسوس ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ اس طرح کی باتیں جو بااقتدار مخاطب کے لیے کچھ تکلیف دہ ہو سکتی ہیں اور عام حالات میں ردعمل پیدا کر سکتی ہیں، ہر ایسے موقع پر میں نے دیکھا کہ مولانا کی قدر ان کی نظر میں بڑھ گئی، چنانچہ اس موقع پر شاہ مراکش دروازہ تک مولاناؒ کو پہنچانے آئے اور شکوہ کیا کہ آپ کو کئی مرتبہ آنے کی دعوت دی گئی آپ نہ آسکے، آپ آیا کیجئے۔" (۱)

حضرت مولاناؒ جس ملک میں گئے بڑی حکمت اور خوبصورتی سے وہاں کے اہل سلطنت وحکومت کو خدمت دین کے لیے متوجہ فرمایا، بہت سے ملکوں میں اس کے بہتر نتائج سامنے آئے۔

یمن

۱۹۸۴ء میں حضرت مولانا نے یمن کا پہلا سفر کیا، وہاں ہر طبقہ کی جانب سے ان کا عظیم الشان استقبال ہوا، ذمہ داران حکومت نے تشریف آوری کو بڑی اہمیت دی اور فوج کے سامنے بھی دو مرتبہ خطاب کا موقع دیا، صدر، نائب صدر، وزیر اعظم اور اہم وزراء وعمائدین سے ملاقاتیں ہوئیں، صنعاء یونیورسٹی میں خطاب ہوا، ریڈیو اور ٹی وی پر خطاب کا موقع دیا گیا، ملک کے مختلف شہروں میں عوامی جلسوں میں خطاب ہوا، اس کے علاوہ دانشوروں کے خصوصی اجتماع میں خطاب ہوا اور حضرت مولانا نے ان کے

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ایک عہد ساز شخصیت: ۱۴۳-۱۴۴

سامنے یمن کی وہ خصوصیات بیان کیں جو زبان نبوت سے ارشاد ہوئی ہیں اور فرمایا کہ ان خصوصیات کو باقی رکھنا اہل یمن کی ذمہ داری ہے، مغربی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور مغربی تمدن کو تعلیم وثقافت کے ذریعہ ملک میں رائج کرنے کے خطرات سے آگاہ کیا۔

امارات

خلیج وامارات کے حکمرانوں میں سے اکثر حضرت مولاناؒ سے نہ صرف واقف بلکہ ان کے قدرداں اور محبت رکھنے والے تھے، ان میں حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی کو حضرت مولانا سے خاص تعلق تھا، حضرت مولانا ان کی دعوت پر شارقہ بھی تشریف لے گئے، ایک مرتبہ وہ ازخود حضرت مولانا سے ملنے لکھنؤ تشریف لائے، دارالعلوم میں اس موقع پر ایک نشست ان کے استقبال کے لیے رکھی گئی، اس میں حضرت مولاناؒ نے اپنی تقریر میں ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

"نعم الأمير على باب الفقير و بئس الفقير على باب الأمير"

(آپ قابل تعریف ہیں کہ فقیر کے دروازے پر آئے)

۱۹۷۶ء کے خلیج کے ایک سفر میں حضرت مولانا نے ابوظبی کے دیوان امیری میں ایک پرمغز تقریر فرمائی، جس کا عنوان تھا: ''ایک صاحب شعور مسلمان موجودہ تہذیبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟''

حضرت مولانا کا آخری بیرونی سفر بھی دبئی کا ہوا، جس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا کو ''اعلیٰ عالمی اسلامی شخصیت ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا گیا، یہ رمضان کا مہینہ تھا، ضعف بھی بہت تھا، اس لیے حضرت مولانا کو سفر سے بڑا تردد ہو رہا تھا، کئی مرتبہ معذرت بھی فرمائی لیکن کمیٹی کے ذمہ داروں نے بے حد اصرار کیا، مولانا تقی الدین صاحب نے امید دلائی کہ حضرت کے خطاب اور وہاں کے کچھ قیام سے بہتر تبدیلی پیدا ہونے کی توقع ہے، حضرت مولانا اسی امید پر راضی ہو گئے اور اپنے رفقاء کے ساتھ

خصوصی جہاز سے دبئی تشریف لے گئے، پروگرام میں حضرت کے لیے ایوارڈ کا اعلان ہوا اور فوراً ہی حضرت مولانا نے دینی تعلیمی اداروں کے لیے اس کو تقسیم کرنے کا اعلان فرمادیا، تقریب میں مملکت کے وزراء اور اہم عہدہ داران بھی موجود تھے، حضرت مولانا کا ضعف انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر اس کے باوجود خطاب فرمایا اور اقبال کا یہ شعر پڑھا:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

عربی میں حضرت مولانا نے جب اس کی ترجمانی فرمائی تو پورا ہال جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تاثر میں ڈوب گیا۔

بقول کسی عارف کے ''جب مقربین نوازے جاتے ہیں تو سراپا فیض بن جاتے ہیں۔'' حضرت مولانا نے اپنی کمزور و ناتواں آواز میں جو کچھ فرمایا وہ دلوں میں اترتا چلا گیا۔

حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی اور ابوظبی کے نائب وزیر اعظم شیخ سلطان بن زائد خود ملاقات کے لیے آئے، کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اس مختصر مدت قیام میں پورے دبئی کی فضا بدل گئی، حکام و امراء پر اس کا اثر پڑا، تین روز کے قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی اور یہی حضرت مولانا کی زندگی کا آخری بیرونی سفر ثابت ہوا۔

ایران

۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا پہلی مرتبہ ایران تشریف لے گئے، وہاں اہم لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، وزیر تعلیم سے گفتگو کے دوران حضرت مولانا نے ان سے ایک ایسا چبھتا ہوا سوال کیا جس میں سمجھنے والے کے لیے پورا پیغام موجود ہے، اس سوال کا تعلق تاریخ اور فلسفۂ تاریخ سے ہے، جس کو اقبال نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

حضرت مولانا نے سوال کیا کہ ایران کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو بعض اوقات محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس ایران میں بجز Genius اور عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوتا تھا، اب اس ذہنی وعلمی زوال اور قحط الرجال کی کیا توجیہ ممکن ہے؟ صدیاں گذرتی چلی جارہی ہیں اور متوسط سطح سے بلند اور عالمی شہرت کا کوئی آدمی سننے میں نہیں آتا؟ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا، پھر خود ہی مولانا نے اس کے دو اسباب تحریر فرمائے ہیں، ایک اپنے خاص مسلکی موقف میں متعصبانہ رویہ اور دیگر مسلکوں کے معاملہ میں عدم رواداری، اور دوسرے تصوف سے بُعد جس نے ساز دل کو چھیڑنے اور روح کے چشموں کو جاری کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں پر وہ دلچسپ واقعہ بھی ذکر کردیا جائے جو ایرانی انقلاب کے قائد آیت اللہ خمینی کے ساتھ پیش آیا، ہوا یہ کہ حضرت مولانا ''رابطہ عالم اسلامی'' کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے، اجلاس میں شرکت کے لیے عراق سے ایک وفد آیا، خمینی صاحب ہی اس کی قیادت کررہے تھے، خمینی صاحب اس وقت انقلاب ایران سے قبل عراق میں ایک طرح سے جلاوطنی کا وقت گذار رہے تھے، حضرت مولانا اور خمینی صاحب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا گیا تو خمینی صاحب نے کہا:

"نعم! أعرفه من خلال كتابة ردة ولا أبابكر لها يا ليته سماه ردة ولا أبا حسن لها"

(ہاں! ہم مولانا سے اس کتاب کے ذریعہ سے واقف ہیں جس کا نام انہوں نے ردة ولا أبا بكر لها رکھا ہے۔ اس کا نام ردة ولا أباحسن لها ہوسکتا تھا)

حضرت مولانا فرماتے ہیں: ہم نے کہا: تعبیر یہ ہے کہ "ردة ولا أبا بكر لها و

قضية ولا أبا حسن لها"

اس موقع پر اگلے روز رابطہ کے ارکان کو بیت اللہ میں داخلہ کے لیے مدعو کیا گیا، لیکن ہجوم کی وجہ سے ان حضرات کو ذرا انتظار کرنا پڑا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ہم مطاف میں ایک کنارے جا کر بیٹھ گئے، وہیں مولانا مودودی بھی آ گئے، کچھ دیر کے بعد خمینی صاحب آ کر کہنے لگے:

"هنا علمان من أعلام العالم الاسلامي فلندع الله"

(یہاں عالم اسلام کے دو قائد تشریف رکھتے ہیں ہمیں دعا کرنی چاہیے)

اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر خود ہی دعا شروع کر دی؛

"اللهم اغفرلنا و لاخواننا الذين سبقونا بالايمان"

اس جملہ کو دہراتے رہے، بقیہ آیت نہیں پڑھتے تھے، تو ہم نے آیت کو مکمل کرتے ہوئے کہا:

"ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا انك رؤوف رحيم"

(اے اللہ ہمارے دلوں میں ان کے لیے کوئی کھوٹ باقی نہ رکھ جو ایمان لا چکے)

اس پر مولانا مودودیؒ نے کہا: آپ نے لقمہ دے ہی دیا۔

مولانا کے اس عمل کو وہ زیادہ سمجھ سکتا ہے جو شیعوں کے عقائد سے واقف ہو کہ وہ صحابہ سے کس درجہ بدگمانی رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے دو تین صحابہ کے باقی سارے حضرات (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

خمینی صاحب ایرانی انقلاب کے بعد اس کے قائد اور روح رواں بنے، ایسے متعدد مواقع ہیں کہ جہاں حضرت مولانا نے پوری جرأت اور قوت کے ساتھ حق کا

اظہار فرمایا اور مصلحت آمیزی کے بجائے بالکل دوٹوک انداز میں بات کہی، یہی حضرت مولانا کا وہ توازن فکر وعمل ہے جو ان کو تمام معاصر داعیوں اور مصلحین سے ممتاز کرتا ہے، ضرورت سمجھی تو مصلحت کا خیال فرمایا، اگر کھل کر بات کرنا مناسب ہوا تو کسی کی بھی رعایت نہیں کی، نہ ان کو کسی کی ملامت کا ڈر ہوا اور نہ کسی قید و بند کا۔

ایک موقع پر ''رابطہ عالم اسلامی'' کے اجلاس میں (جب کہ سعودی حکومت عیسائیوں کے بارے میں نرم رویہ رکھتی تھی اور صرف یہودیوں کو ہی ہر غلط اقدام کا الزام دیا جاتا تھا) حضرت مولانا نے بڑی پر جوش اور مبنی بر حقائق تقریر کی اور اس میں صاف کہا کہ جس طرح یہودی مجرم ہیں، اسی طرح عیسائی بھی ان کے جرم میں شریک ہیں، ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا، تقریر بالکل دوٹوک اور جرأت وقوت سے بھرپور تھی، اور اس میں کھل کر اس نظریہ کی تردید کی گئی تھی جو اس وقت سعودی حکومت نے اختیار کر رکھا تھا، اور رابطہ حکومت ہی کا ایک ادارہ تھا، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ بھی حضرت مولانا کے ہمراہ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ مولانا کو بھی تقریر کے جوش کا احساس تھا مگر فرمانے لگے:

''الحمد للہ حجاز مقدس بار بار آچکا ہوں، اب اگر حکومت پابندی بھی عائد کردے تو مجھے پرواہ نہیں، حق بات یہی ہے کہ اس کو یہاں کے ذمہ داروں کو سمجھنا چاہیے۔''

اس واقعہ کے بعد ہی شاہ نے ملاقات کے لیے مولانا کو دعوت دی، اور بڑا اکرام کیا اور اس واقعہ کا تذکرہ تک نہیں کیا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ طبقہ خوب جانتا تھا کہ حضرت مولانا عام لوگوں کی طرح نہیں جو اپنی شہرت اور عزت کی خاطر بھی ضرورت بے ضرورت سلاطین وامراء کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں اور اس کو کلمة حق عند سلطان جابر کا عنوان دیتے ہیں، وہ خوب سمجھتا تھا کہ مولانا ایک مخلص اور درد مند داعی ہیں، اور جو کچھ فرماتے ہیں وہ خیر خواہی کے جذبہ سے ہی فرماتے ہیں، مولانا کی شفاف زندگی ان کے سامنے تھی، اس لیے عام طور پر یہ طبقہ حضرت مولانا کے برملا

اظہار حق اور نکیر پر متاثر ضرور ہوا لیکن دل گیر نہیں ہوا۔

ترکی

ترکی خلافت اسلامیہ کا آخری مستقر رہ چکا تھا، ترکوں نے حفاظت دین اور دفاع اسلام کا بڑا کام کیا تھا، یہ قوم دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں ہمیشہ ممتاز رہی تھی، خلافت اسلامیہ کے سقوط کمال اتاترک کے اقتدار میں آجانے اور اسلامی شعائر کو مٹادینے کی تمامتر کوششوں کے باوجود غیرت اسلامی کی چنگاری ان کے سینوں میں دبی ہوئی تھی، عرصہ کے بعد جب پہلی مرتبہ عربی میں اذان دی گئی تو قوم خوشی میں بے قابو ہوگئی، لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور سجدہ میں گر گئے، لیکن اس عرصہ میں ان کو عربی رسم الخط سے نا آشنا کر دیا گیا، اور اسلامی تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب نے اپنی تمام بے حیائیوں اور بے شرمیوں کے ساتھ وہاں کے پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، وہاں کی وہ اسلامی فوج جو کبھی مسجد کے میناروں کو دیکھ کر جوش اسلامی سے بھر جایا کرتی تھی، اب وہ اسلام سے نہ صرف نا آشنا بلکہ معاند بنی ہوئی تھی، اس کے ذہن و دماغ کو پوری طرح مسخ کیا جا چکا تھا، لیکن عوام کے دلوں میں ایمان کا بیج موجود تھا، اور اس کی اس طرح آبیاری کی ضرورت تھی کہ وہ برگ و بار لا سکے، غیرت دینی کی دبی ہوئی چنگاری کو اس طرح ہوا دینے کی ضرورت تھی کہ وہ شعلۂ جوالہ میں تبدیل ہو سکے، اور ترک قوم دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار واپس لا سکے۔

حضرت مولاناؒ وہاں کی تاریخ سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس کے رمز شناش تھے، اس قوم سے مولانا کو بڑی امیدیں تھیں، اپنے سفروں میں وہاں کے مختلف طبقوں کو خطاب کر کے حضرت مولانا نے صاف صاف فرمایا تھا:

جب ناچیز اس آیت کی تلاوت کرتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (البقرة- ۱۴۳)

(اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی ضائع کردے، خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان اور صاحب رحمت ہے)

تو اس کا ذہن ترکی قوم کی طرف جاتا ہے اور ذہن میں یہ آتا ہے گویا اللہ تعالیٰ ترکوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ تمہارے پاس جو ایمان کی دولت تھی اور تمہارے اسلاف نے حمایت وحمیت اسلامی کا جو شاندار ثبوت دیا، جہاد کا جھنڈا بلند کیا، بازنطینی شہنشاہی کا دار السلطنت قسطنطنیہ فتح کیا، خلافت اسلامیہ کی ذمہ داریاں قبول کیں، مقامات مقدسہ کی حفاظت کی اور یورپ پر بھی اسلام کی دھاک بٹھادی، اللہ تعالیٰ ان کارناموں کو ضائع نہیں کرے گا۔" (۱)

حضرت مولاناؒ نے ترکی کے متعدد سفر کیے، لیکن ذمہ داران حکومت میں سے کسی اہم آدمی سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی، تاہم رفاہ پارٹی کے سربراہ نجم الدین اربکان خود کئی مرتبہ حضرت مولانا سے ملے اور مولانا نے ان کو ترکی کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اہم مشورے دیئے، انہوں نے بڑی حکمت سے اسلامی عنصر کو حکومت میں داخل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے، خود وہ نائب وزیر اعظم اور پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے اور انہوں نے بتدریج بعض اہم اقدامات کیے، بعد میں وہ خود اگرچہ اس عہدہ پر فائز نہ رہ سکے لیکن انہوں نے بعض ایسے افراد تیار کردیئے جو قدرے اسلامی ذہن رکھنے والے تھے، اور ان کے لیے اس کے مواقع تھے کہ وہ حکومت میں رہ کر کچھ اصلاحات کرسکیں۔

حسن اتفاق کہ حضرت مولانا جب ۱۹۹۶ء میں ترکی تشریف لے گئے تو وہاں وہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے، لیکن سوئے اتفاق کہ وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھے، بلکہ کسی ضروری بیرونی سفر پر گئے ہوئے تھے، اس وقت حضرت مولانا سے ان کی ملاقات نہ ہوسکی، لیکن حضرت نے ان کے نام مشوروں پر مشتمل ایک خط

(۱) کاروان زندگی: ۵/ ۲۲۸

تحریر فرما کر ایک ذمہ دار شخص کے حوالہ کیا جو بعد میں ان کو پہنچا دیا گیا۔

خط میں حضرت مولانا نے سب سے پہلے ترکوں کے کارناموں کا ذکر کیا، ان کی حفاظت دین اور دفاع اسلام کی کوششوں کا تذکرہ فرمایا پھر فرمایا:

''سب سے پہلا بنیادی اقدام (جو پرعزم اور جرأت مندانہ ہو اور ایسا انقلاب انگیز ہو جس کی اس ملک اور اس محبوب قوم کی ضرورت ہے) یہ ہونا چاہیے کہ اس قوم کو یورپ و امریکہ کی غلامی سے آزاد کرایا جائے، خاص طور پر اس طبقہ کی فکر کی جائے جو یونیورسٹیوں کا ساختہ پرداختہ ہے، جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار آنے والی ہے، اس کو لادینیت اور مغربی مسیحیت کے پھندے سے نکالا جائے اور اس پر جو عقلی، تمدنی، تہذیبی اور تنظیمی مغربی چھاپ ہے اس کو زائل کیا جائے، یہ اسی تہذیب جدید کا نتیجہ ہے کہ نئی تعلیم یافتہ نسل اپنی باطنی قوت، جوش و جذبہ اور قربانی کی روح سے عاری ہوگئی ہے، اس کے اندر مادی آرائش و زیبائش سے مقابلہ کرنے اور سیاحت کی عقلی و تمدنی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے، نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد بحال کیا جائے، خاص طور پر تعلیم یافتہ اور مثقف نوجوانوں کی فکر کی جائے جو اسلام کے خلود و بقا اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اسلامی قیادت کی صلاحیت اور اس پر اعتماد بحال کرنے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور جو عقلی و جذباتی اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

اس نئی نسل میں صحافت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے اسلامی عقائد اور اسلامی نظام انسانیت و اجتماع کے بارے میں جو احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے، اس کو ایسے اسلامی لٹریچر کے ذریعہ سے دور کیا جائے جو دین پر اعتماد بحال کر سکے، یہ احساس ایک ایسا مہلک مرض ہے جو

اس امت کو روگ کی طرح لگ گیا ہے، وہ امت جس کو اپنے دین پر ناز ہے اور اپنے عقائد وشعائر پر فخر ہے، وہ ایک معنوی ارتداد کا شکار ہورہی ہے اور یورپ کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔.....

اس کے لیے تعلیم وتربیت، تہذیب، ذرائع ابلاغ، اور صحافت کے نظام کو بدلنا ہوگا اور اس نصاب تعلیم کو رواج دینا ہوگا جو نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کی اسلامی تشکیل کر سکے۔

ان تمام کاموں میں جلد بازی اور جوش کے بجائے حکمت وتدریج سے کام لینے کی ضرورت ہے۔.....الحمدللہ آپ کے اندر اس کی صلاحیت موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیادت کا موقع عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے اور امت اعدائے اسلام کی جن سازشوں کا شکار ہوگئی ہے آپ کے ذریعہ وہ اس شکنجے سے نکل سکے۔"(۱)

مسجد فاتح کے امام شیخ امین معراج کا حضرت مولانا سے طالب علمی کے دور سے تعلق تھا، مولانا نے ان کو وصیت فرمائی تھی کہ ترکی میں مکاتب دینیہ قائم کریں، انہوں نے اس وصیت وتاکید پر عمل کیا، جس کے نتیجہ میں وہاں حالات بہتر ہوئے، اسی طرح حضرت مولانا کے فیض یافتہ اور ان کی فکر کی نمائندہ شخصیت شیخ یوسف صالح قاراجا مسلسل حضرت مولانا کی اس فکر کے مطابق تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہن سازی کی کوشش کرتے رہے، موجودہ صدر موصوف کے فیض یافتہ ہیں اور دینی ذہن رکھتے ہیں اور حکمت کے ساتھ دین کے احیاء میں مصروف ہیں۔لعل اللہ یحدث بعد ذلك أمراً.

پاکستان

مملکت خداداد پاکستان سے حضرت مولانا کا تعلق خاندانی بھی تھا اور روحانی

(۱) کاروان زندگی: ۶/ ۲۹۷-۲۹۹

بھی، خاندان کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں سکونت پذیر تھا، جن میں حضرت مولانا کے حقیقی پھوپھا اور استاد مولانا سید محمد طلحہ صاحب اور پھوپھی صاحبہ کے علاوہ متعدد قریبی اعزہ اور اہل تعلق بھی تھے، حضرت مولانا کے شیخ اول حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ اور مربی و استاذ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کا تو وہ مستقل مسکن اور وطن تھا، ان حضرات کے علاوہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کا بھی وہ وطن تھا، وہاں حضرت کا طویل طویل قیام ہوتا رہتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد سے ۱۹۷۸ء تک بار بار مولانا پاکستان تشریف لے گئے، لیکن کبھی حکومت کے کسی ذمہ دار سے نہ حضرت مولانا نے ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی دوسری طرف سے تحریک ہوئی، سب سے پہلے صدر جنرل ضیاء الحق صاحب مرحوم ہیں جنہوں نے حضرت مولانا سے ملاقات کی، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ ''رابطہ عالم اسلامی'' کی جانب سے جون ۱۹۷۸ء کے اواخر میں کراچی میں ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی، پاکستان کے وزیر قانون اور امور مذہبی جناب اے۔ کے۔ بروہی صاحب نے کانفرنس کی صدارت کی اور صدر پاکستان نے افتتاح کیا، بروہی صاحب حضرت مولانا سے عقیدت و محبت رکھتے تھے، کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے اختتام پر انہوں نے خود جنرل صاحب کو حضرت مولانا سے ملوایا، وہ حضرت مولانا سے پہلے سے واقف تھے، بہت تعلق و عقیدت سے ملے اور حضرت مولانا سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کسی خاص دعا کی تلقین فرمادیں، حضرت مولانا نے ان کے سامنے درود شریف کی اہمیت بیان فرمائی اور فرمایا کہ آپ اسی کو مضبوطی سے پکڑ لیجئے یہی سب ضرورتوں کے لیے کافی ہے، اس کے علاوہ حضرت مولانا نے ان کو خاص طور پر حجاز مقدس اور حرمین شریفین کے بارے میں ان کی ذمہ داری یاد دلائی اور ان کی حفاظت کے لیے اپنی خدمات اور مساعی صرف کردینے کی طرف متوجہ کیا، جنرل صاحب نے ان ہدایات کا بڑا اثر قبول کیا، اور درود شریف کا اپنی زندگی میں خاص اہتمام کیا، اس کے

علاوہ بار بار حجاز مقدس حاضری کو بھی اپنی زندگی کا ایک وظیفہ بنالیا، وہاں کی حکومت سے بہت ہی قریبی دوستانہ تعلقات قائم کیے اور ہر طرح ان کے تعاون کی فکر رکھی۔

اسی سفر میں انہوں نے اسلام آباد کے صدارتی محل میں حضرت مولانا کو تشریف آوری کی دعوت دی اور ملاقات کے دوران کہا کہ ''حضرت میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کے جواب میں حضرت مولانا نے بڑی حکیمانہ بات فرمائی کہ

''آپ ہندوستان سے تعلقات بہتر رکھیں تا کہ ہم اطمینان سے معتدل اور پرسکون ماحول میں اپنے تعمیری و تعلیمی و رفاہی کام کر سکیں''

صدر صاحب نے اس کی پوری تائید کی اور ساری زندگی اسی پالیسی پر گامزن رہے، نازک موقعوں پر بھی انہوں نے ضبط نفس اور حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑا، سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولانا نے ان کو ایک مفصل مکتوب اور اپنی اہم تصنیفات مطالعہ کے لیے بھیجیں، مکتوب میں حضرت مولانا نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بعض تجاویز پیش کی تھیں، صدر موصوف نے کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور اپنے شکریہ کے خط میں اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

۱۹۸۰ء میں حضرت مولانا پاکستان تشریف لے جانے والے تھے، مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر سفر ملتوی ہوگیا، حضرت مولانا نے اس مناسبت سے صدر صاحب کو ایک مفصل مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان کو بطور خاص پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی طرف متوجہ کیا، صدر صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''نظام اسلام کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں، ہماری کوشش ہے کہ ہم نظام اسلامی کو جلد از جلد تمام زندگی کے شعبوں میں نافذ کریں، کیونکہ اسلام کو عملی زندگی میں اپنانا ہمارا صرف دینی تقاضا ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کا دار

و مدار بھی اسی پر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کار خیر کو مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔"(۱)

۱۹۸۴ء میں حضرت مولانا نے شرق اردن، یمن اور حجاز کا سفر کیا، واپسی میں چند روز کے لیے پاکستان میں قیام فرمایا، صدر صاحب کو جب معلوم ہوا تو کراچی میں بڑے اہتمام سے حضرت مولاناؒ سے ملے، حضرت مولانا نے ان کو مسجد اقصیٰ کا وہ خوبصورت مرمری ڈھانچہ پیش کیا جو عمان میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اس میں زبان حال سے یہ اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت ایک صاحب ایمان مسلم صدر مملکت کی ذمہ داری ہے۔

۱۹۸۶ء میں صدر صاحب کی حضرت مولانا سے آخری ملاقات ہوئی، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت مولانا نے استنبول سے واپسی میں تین روز کے لیے کراچی میں قیام فرمایا، صدر صاحب کو کسی طرح حضرت کی تشریف آوری کی خبر ہوئی تو انہوں نے فون پر رابطہ کر کے اسلام آباد آنے کی دعوت دی، حضرت مولانا نے معذرت فرمائی تو وہ خود صرف ملاقات وزیارت کے لیے کراچی تشریف لائے۔

صدر صاحب حضرت مولانا سے بڑی قدر دانی کا تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا کی ہدایات ومشوروں کی بڑی قدر کرتے، حضرت مولانا کی بعض کتابیں انہوں نے بڑے شوق سے پڑھیں اور ان سے فائدہ اٹھایا، "جب ایمان کی باد بہاری چلی"(۲) انہوں نے فوج کے نصاب میں داخل کی، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب "سیرت النبیؐ" (جلد ہفتم) کا انہوں نے خود مطالعہ کیا جو معاملات اور اسلام کے نظام حکومت اور سیاست کے موضوع پر مشتمل ہے، حضرت مولانا کا اس پر بڑا پر مغز اور مبسوط مقدمہ ہے، اس کتاب سے وہ بہت متاثر ہوئے اور حضرت مولانا کے لیے انہوں نے حکومت پاکستان کی جانب سے ایک لاکھ روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا، حضرت

(۱) نذرانہ عقیدت، مرتب فضل ربی ندوی، مطبوعہ کراچی

(۲) جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے بڑے مؤثر واقعات بڑی دلکش زبان میں بیان کیے گئے ہیں

مولانا نے یہ رقم بجائے خود قبول کرنے کے اس کا نصف دار المصنفین اعظم گڑھ کو بھیج دینے کی ہدایت کی جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، اور نصف سید صاحب کے پسماندگان کو دے دینے کے لیے فرمایا، اس کے بعد جنرل صاحب سے حضرت مولانا کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ''آپ قبول فرما لیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔'' حضرت مولانا نے فرمایا: ''میرا یہ طرز عمل پہلے بھی نہیں رہا۔'' صدر صاحب فیصل ایوارڈ کے بارے میں حضرت مولانا کے طرز عمل سے واقف تھے، وہ اس پر خاموش ہو گئے۔

حضرت مولانا کو صدر صاحب سے بڑی امیدیں تھیں، جب بھی ان سے ملاقات ہوئی تو ضرور ان کو ہدایات اور مشورے دیتے، ایک ملاقات میں حضرت مولانا نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ فوج میں ''فتوح الشام'' جیسی کتابیں بھی باقاعدہ پڑھوائی جائیں تاکہ ان کے اندر جذبہ جہاد پیدا ہو اور اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں سے واقفیت ہو سکے، وہ بھی بہت سنجیدہ اور ٹھوس فکر کے حامل تھے اور ان کے ذہن سے اعلائے دین کے بہت سے خاکے تیار رکھتے تھے اور وہ بڑی حکمت سے ان میں رنگ بھرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک وہ حادثہ پیش آیا جس نے سارے منصوبے کو زیروزبر کر کے رکھ دیا۔

عالم اسلام کے حکمرانوں میں شاہ فیصل مرحوم (فرماں روا مملکت سعودیہ) اور جنرل ضیاء الحق مرحوم (صدر پاکستان) کا نام سب سے نمایاں ہے جنہوں نے اعلاء دین اور اتحاد اسلامی کی فکر کی، حضرت مولانا کو ان دونوں سے خاص تعلق تھا اور یہ دونوں بھی حضرت مولانا کی ہدایات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر عمل کی کوشش بھی کرتے تھے۔

کسی سفر پاکستان کے موقع پر حضرت مولانا سے انٹرویو کے دوران یہ سوال کیا گیا کہ صدر پاکستان بہت دنوں سے نفاذ شریعت کی بات کر رہے ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی، اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت

مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ دعوت کا ایک زریں اصول ہے اور اس میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے بڑی رہنمائی ہے اور اس سے حضرت مولانا کے طبقۂ حکمراں میں دعوت کا طریقۂ کار بھی وضاحت سے سامنے آتا ہے، اس لیے اس جواب کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، حضرت مولانا نے فرمایا:

''ایسے موقع پر دو رویے ہو سکتے ہیں؛ ایک یہ کہ کوئی مسلمان جو صورتاً بڑا متشرع نظر نہ آتا ہو آپ سے کہے میں ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتا ہوں، آپ اس سے کہیں کہ یہ صورت اور خانۂ خدا کی تعمیر! آپ کو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق بھی ہوئی، اور آپ کے باپ دادا نے بھی کبھی یہ کام کیا ہے؟! تو اگر وہ مسجد بنانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے تو کان پکڑ لے گا اور اس ارادہ سے باز آجائے گا، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ کہیں سبحان اللہ! ارادہ مبارک ہو آپ ہی جیسے لوگوں نے مسجدیں بنائی ہیں، ہم بھی اس کار خیر میں شریک ہیں اور آپ کا ہاتھ بٹائیں گے، تو اگر اس کو اس کام میں تردد تھا، تو وہ اس کا عزم کر لے گا اور مسجد کی تعمیر کی سعادت حاصل کرے گا۔''(۱)

سردار فاروق احمد لغاری پاکستان کے وہ آخری رہنما ہیں جن کو حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ پاکستان میں عرصہ سے ''رابطۂ ادب اسلامی'' کا دفتر قائم ہو چکا تھا، وہاں کے ذمہ داروں کو خیال ہوا کہ سر زمین پاکستان پر رابطہ کا ایک عالمی اجلاس بلایا جائے جس میں صدر رابطہ کو بھی دعوت دی جائے، اکتوبر ۱۹۹۷ء کی تاریخیں اس کے لیے طے کی گئیں اور حضرت مولانا نے اپنے ضعف کے باوجود سیمینار کی دعوت قبول فرمالی، اس وقت کے صدر مملکت فاروق احمد لغاری کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تو حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خبر سن کر

(۱) پرانے چراغ: ۳/ ۱۷۸-۱۷۹

وہ فوراً ہی شرکت کے لیے تیار ہو گئے، جناب مصطفیٰ صادق خاں بیان کرتے ہیں کہ دعوت نامے میں انہوں نے جب حضرت مولانا کا نام پڑھا تو پوچھا کہ

''یہ وہی علی میاں تو نہیں ہیں جن کا تعلق لکھنؤ شہر سے ہے اور اہل عرب بھی ان کا بے حد احترام کرتے ہیں؟ برسوں کی بات ہے کہ سوئیزرلینڈ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی، ایک مصری عرب سعید رمضان بھی ہمارے ساتھ تھے، وہاں سیر کرتے کرتے نماز کا وقت ہوا تو میں نے اور اس عرب نے مولانا کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان کا حسن قرأت جذب وشوق اور خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کا منظر آج بھی مجھے یاد ہے، میں اور میرے عرب دوست اس ناقابل فراموش منظر سے بہت محظوظ ہوئے تھے، اگر یہ وہی علی میاں ہیں تو پھر اس دن کی میری تمام مصروفیات ومعمولات منسوخ ہیں، اس افتتاحی اجلاس میں ضرور شریک ہوں گا۔''(۱)

صدر موصوف نے حضرت مولانا کا سرکاری سطح پر استقبال کیا، لاہور کے الحمراء ہال میں افتتاحی اجلاس ہونے والا تھا، جب صدر صاحب تشریف لائے تو منتظمین نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے:

''یہ تو میرا فرض تھا، مولانا تشریف لائیں اور میں نہ آؤں یہ کیسے ممکن ہے؟! شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کا شرف بخشا گیا۔''(۲)

بڑے احترام وعقیدت سے وہ حضرت مولانا سے ملے، پورے اجلاس میں شریک رہے، وہ جمعہ کا دن تھا، حضرت مولانا کو جمعہ کی نماز جامعہ اشرفیہ کی مسجد الحسن میں پڑھنی تھی اور خطاب بھی کرنا تھا، صدر موصوف نے بھی وہیں نماز پڑھی اور خطاب

(۱) مجلہ قافلہ ادب اسلامی: ۱/ ۱۳۸ (۲) مجلہ قافلہ ادب اسلامی: ۱/ ۱۴۰

سنا اور دعا میں بھی شریک رہے، اس موقع پر متعدد مرتبہ حضرت مولانا نے یہ دعا بھی فرمائی کہ ''یا اللہ! پاکستان کو صحیح معنی میں ایک اسلامی ریاست بنادے'' صدر موصوف کی موجودگی میں حضرت مولانا کی اس دعا میں موصوف کے لیے ایک پیغام بھی تھا اور دعوتِ فکر و عمل بھی۔

ہندوستان

پیام انسانیت کی تحریک حضرت مولانا کی اسی فکر کا نتیجہ تھی، مولانا کو اس کا احساس تھا کہ یہاں کی اکثریت کو اعتماد میں لیے بغیر کوئی بھی کام آسان نہیں اور خاص طور پر دعوت کا فریضہ اسی وقت بہتر طریقہ پر اور ہوسکتا ہے جب مخاطب کے دل کی کھڑکیاں کھول لی جائیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد جو حالات یہاں پیدا ہوگئے یا پیدا کرائے گئے، صرف مسلمانوں ہی کے بارے میں نہیں بلکہ اسلام کے بارے میں ایسی غلط فہمیاں پھیلا دی گئیں کہ ان کے دماغوں کے سارے روزن بند ہوگئے، اور باقاعدہ ایسی تنظیمیں وجود میں آگئیں جن کا کام ہی ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر بھرنا تھا، آر ایس ایس نے خاص طور پر بہت منظم طریقہ پر یہ کام شروع کر دیا، یہ حالات صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، پورے ملک کے لیے تشویشناک تھے، اسی لیے ہندوؤں کی بھی ایک تعداد تھی جو ملک کے لیے سچی ہمدرد تھی، اور وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اگر ملک اسی رخ پر چلا گیا تو پھر اس کو بچانا مشکل ہے، مسلمان طبعی طور پر اس کا اصل نشانہ تھے، اس لیے سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں کی تھی، لیکن بہت کم لوگ تھے جو اس کو محسوس کر رہے تھے اور وسیع فکر و نظر کے ساتھ اس پر غور کر رہے تھے۔

یہ بات بار بار گذر چکی ہے کہ مولانا کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ انہوں نے تاریخ کا مطالعہ دعوتی نقطہ نظر سے کیا تھا اور قرآن مجید کی روشنی میں اس سے ایسے بنیادی اصول نکالے تھے جن تک عام نگاہ رکھنے والے کا پہنچنا مشکل تھا، مولانا نے بھانپ لیا

کہ اگر رخ کو بدلا نہ گیا تو حالات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، اس کے لیے حضرت مولانا نے بہت بلندی سے گفتگو کی، یہاں کے ہندو قائدین اور کچھ غور وفکر کرنے والوں کو متوجہ کیا۔

حضرت مولانا فرماتے تھے کہ زندگی کے دھارے سے اگر مسلمان اپنے آپ کو الگ کرلیں گے تو وہ بے حیثیت ہو کر رہ جائیں گے اور آہستہ آہستہ ان کو کنارے لگا دیا جائے گا، زندگی کے دھارے سے مراد انسانی زندگی کی ضرورتیں اور مشترک انسانی قدریں ہیں، اس سے ہرگز قومی دھارا مراد نہیں، اس کے بارے میں حضرت مولانا کی حساسیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ صاف فرماتے تھے کہ اگر قومی دھارے میں ضم ہونے کی بات سوتے میں بھی کان میں پڑ جائے تو ایک مسلمان کی چیخ نکل جائے، مولانا نے دسیوں مرتبہ بڑی بلند آہنگی اور قوت کے ساتھ فرمایا کہ اس ملک میں ہم اپنے ملی تشخص کے ساتھ رہیں گے، دین کی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی ہم دستبردار نہیں ہو سکتے، مگر مولانا یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اب مسجدوں اور مدرسوں کی چہار دیواریوں میں بہت دنوں تک محدود نہیں رہ سکتے، ان کو آگے بڑھ کر اپنی افادیت ثابت کرنی پڑے گی، اس ملک کے لیے بھی اور انسانیت کے لیے بھی، یہ ان کے تحفظ وبقا کا ایک بڑا ذریعہ ہے؛

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ (الحجر: ۱۷)

(بس جھاگ تو بیکار جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے)

بقاء انفع کا بے لاگ قانون حضرت مولانا کے سامنے تھا، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہی مولانا نے اس کی آواز لگائی، بڑے بڑے مشترک اجتماعات کیے اور ان میں وہ حقیقت پسندانہ باتیں کہیں جو سب کے دل کی آواز تھیں، ''تعمیر انسانیت'' کے نام سے یہ تقریریں یکجا شائع کر دی گئی ہیں، ان سے دعوت کے بڑے حکیمانہ طریقے سامنے آتے ہیں،

۱۹۷۴ء تک انفرادی طور پر مولانا یہ کوششیں کرتے رہے، پھر الہ آباد سے باقاعدہ ''تحریک پیام انسانیت'' کا آغاز اسی لیے کیا کہ نقار خانے میں طوطی کی صدا کیا، ضرورت ہے کہ بلند آہنگی کے ساتھ یہ آواز بلند کی جائے، اس کے لیے مولانا نے ملک کے طول و عرض میں بڑے بڑے جلسے کیے، ڈائیلاگ منعقد ہوئے، خطوط لکھے، ملاقاتیں کیں، وزیر اعظم اور ملک کے دوسرے اہل اقتدار کو ملک کی سلامتی، سالمیت اور ترقی کی طرف توجہ دلاتے رہے اور جو چیزیں کسی بھی ملک کے لیے یا سماج کے لیے خطرناک ہوسکتی ہیں اور ان کو سماج کا ناسور سمجھا جاتا ہے، ان کی طرف خاص وعام کو متوجہ کیا۔

حضرت مولانا کی یہ تقریریں ''انسانیت کی مسیحائی'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں اور ان میں بھی کام کرنے والوں کے لیے وہ حقائق ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔

حضرت مولانا اس تحریک کو تمام دینی کاموں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار سمجھتے تھے، پیام انسانیت سے متعلق دیے گئے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

> ''میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں۔''(۱)

حضرت مولانا کا خیال یہ تھا کہ اکثریت کے سامنے اسلام کے تعارف کا بھی یہی راستہ ہے کہ پہلے ان تک پہنچا جائے، اور ان کے سامنے ایسی مشترک باتیں رکھی جائیں کہ وہ خود متوجہ ہوں، اس سلسلہ میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن وضمیر

---

(۱) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو: ۱۱

تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق، اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل ومصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا اور نہیں، یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خداداد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کرسکتا ہے۔''(۱)

ایک جگہ مولانا نے یہاں تک فرمایا کہ'' یہ پورے عالم انسانی کی ضرورت ہے۔'' مولانا کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے، آپ ﷺ نے ''حلف الفضول'' میں شرکت فرمائی تھی، بعد میں بھی آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اگر مجھے کوئی آج بھی اس طرح کے معاہدہ میں شریک کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔

مولانا سے جب سوال کیا گیا کہ اس بھرے پُرے ملک میں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، آپ ہی نے کیوں اپنی یہ ذمہ داری سمجھی کہ اس دعوت کو لے کر کھڑے ہوں؟ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ:

''مسلمان اپنے مذہب کی رو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کرلے، ''اور سب خیریت ہے'' کا سبق نہ دہرائے، مسلمانوں کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے کا حکم ہے، اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی..... یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدانخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدا رسیدہ افراد، نہ عالم وفاضل، نہ بزرگ۔''(۲)

---

(۱) کاروان زندگی: ۱/۳۹۶ (۲) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو: ۱۱-۱۲

مخلوط اجتماعات کی پانچ تقریریں جب ''مقام انسانیت'' کے نام سے شائع کی جانے لگیں تو اس پر حضرت مولانا نے بڑا طاقتور مقدمہ تحریر فرمایا، اس کے آغاز میں حضرت مولانا نے اسی حقیقت کو دوٹوک الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

''نہ صرف ہندوستان بلکہ اس موجودہ دور اور عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض وتعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہوکر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کرکے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار اور موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار ہے۔''(۱)

۲۸، ۲۹، ۳۰؍دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد میں اس موضوع پر ایک بڑی کانفرنس بلائی گئی اور ان الفاظ کے ساتھ ہند گیر مہم کا آغاز کردیا گیا کہ:

''افسوس ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی، ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بن پڑے اس کو شروع کردیں۔''

الہ آباد سے اس تحریک کا باقاعدہ آغاز کیوں کیا گیا اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا فرماتے ہیں :

''الہ آباد سے ہم نے کام کو شروع کیا ہے کیونکہ اس کا نام ہی ''الہ آباد'' یعنی ''خدا کی نگری'' ہے، یہیں سے خدا پرستی کی تحریک اور انسانیت کے احترام کی دعوت شروع ہونا چاہیے، خدا کے بندوں کی عزت، انسانیت کو نئی زندگی دینے اور انسانوں کو انسانیت واخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کا کام اسی شہر سے ہونا چاہیے تھا جو خدا کے

---

(۱) مقام انسانیت:۵

نام سے آباد ہے۔''(۱)

''کل ہند حلقۂ پیام انسانیت'' کے نام سے باقاعدہ لکھنؤ میں اس کا دفتر قائم کر دیا گیا اور کام شروع ہو گیا، یہ کوئی نئی تحریک یا انجمن سازی نہیں تھی بلکہ حضرت مولانا نے ایک صدا لگائی تھی، نہ مخصوص ارکان اس کے لیے منتخب کیے گئے، نہ کوئی باقاعدہ صدر یا جنرل سکریٹری چنا گیا، ایک نامانوس اور نئی صدا لگانے والوں کا یہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا، ایک کارواں تھا جو حضرت مولانا کی قیادت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

تحریک کے ترجمان مولانا اسحاق جلیس ندویؒ اس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱- ''خالص انسانی رشتے اور ہندوستانی ناطے سے ملک میں عام محبت و بھائی چارے کی فضا قائم کرنے اور اخلاقی گراوٹ کا ماحول ختم کرنے کے لیے عوامی رابطہ کی مہم، جلسوں اور سیمینار کا انعقاد، مفید اخلاقی لٹریچر کی مختلف زبانوں میں اشاعت۔

۲- خدمت خلق کے ذریعے روٹھے ہوئے، بیزار اور آپس میں دست و گریباں انسانوں کو زندگی کے حقیقی لطف اور صحیح مقصد سے روشناس کرانا۔

۳- معاشرہ سے رشوت، اقرباء پروری، بدعنوانی، ذخیرہ اندوزی، فرقہ پرستی اور معاشی استحصال کو دور کرنا اور بے حیائی و عریانی کے خلاف بھرپور جدوجہد۔

۴- غلط اور ظالمانہ رسم و راج کے انسداد کی کوشش۔

۵- ملک کے مظلوم، پس ماندہ، غریب اور پریشان حال افراد کی بلا احتیاز مذہب وملت ہر ممکن امداد۔

۶- نوجوان نسل خاص طور سے طلباء میں سنجیدگی، علمی لیاقت اور سماج

---

(۱) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو: ۲۰

کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ ہمارے ملک کو ان خطرات سے
بچایا جاسکے جو نئی نسل کی بے راہ روی سے پیدا ہو رہے ہیں۔
۷- اپنے حلقۂ اثر، محلّہ، بستی، شہر اور پورے ملک میں برادرانہ ماحول
پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش وجدوجہد"۔(۱)

اس تحریک نے آگ پر پانی کا کام کیا، زخموں پر مرہم رکھا اور حالات کو معتدل و پرسکون بنانے میں اہم کردار ادا کیا، پورے ملک کے طول وعرض میں جابجا اس کی کانفرنسیں ہوئیں، جس میں ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ شریک ہوئے، غلط فہمیاں دور کی گئیں، دل صاف کیے گئے اور دماغوں میں نفرتوں کی جو تہیں جم رہی تھی ان کو کھرچا گیا، بقائے باہمی کی فضا قائم کی گئی، اور بڑی حد تک اعتماد کا ماحول بحال ہوا، پیام انسانیت کے ان جلسوں میں حضرت مولانا اکثر افتتاحی خطاب فرماتے تھے اور اس سے پورے اجلاس کا رخ متعین ہوجاتا تھا، بعد میں آنے والے مقررین کی تقریریں اکثر مولانا کی پُرمغز تقریر کی تشریح کے طور پر ہوا کرتی تھیں۔

مولانا کا یہ بھی طرز فکر تھا کہ وہ ملک کے اہل اقتدار کو ملاقاتوں میں اور خطوط کے ذریعہ ان باتوں کی طرف متوجہ فرماتے تھے، مگر یہاں بھی مولانا کا طریقہ وہی تھا کہ پہلے مرحلہ پر کسی نہ کسی درجہ میں خوبیوں کا اعتراف ہوتا اور مشترک بات ہوتی اور پھر اصل مقصد واضح کیا جاتا، یہ دلوں کو کھولنے کا ایک طریقہ تھا۔

اندرا گاندھی

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام جو خطوط ہیں، ان میں بھی مولانا اپنے اصول سے نہیں ہٹے، اور مولانا نے کچھ قابل اعتراف پہلو تلاش کر ہی لیے اور ان کا پہلے تذکرہ فرمایا، اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"میں سب سے پہلے تو آپ کو خلوص قلب سے اس کامیابی پر مبارک

(۱) تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو: ۲۰

باد دیتا ہوں جو آپ نے فرقہ وارانہ فسادات، بڑھتی ہوئی لاقانونیت، انارکی اور دہشت انگیزی کے ختم کرنے میں حاصل کی، جو اس ملک کو ہر قسم کی ترقی کرنے، اور دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اور جس نے ایک بے یقینی اور بے اعتمادی کی فضا پیدا کردی تھی، اس طرح سے ملک کی انتظامی مشنری میں آپ نے جو حرکت وسرعت پیدا کردی وہ بھی ایک قابل مبارک باد کامیابی ہے، اور جو عرصہ کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، اگرچہ مذہب واخلاق کے ایک پیرو، اقوام وملل کی تاریخ کے ایک سچے طالب علم کی حیثیت سے میں اس تمنا کے اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر انتظامی حکومتی اقدامات کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے دلوں کو چھونے، ان کے اندر گہری اور مستقل تبدیلی لانے، احساس ذمہ داری پیدا کرنے اور انسانیت کی عزت واحترام کا جذبہ پیدا کرنے اور سچی وطن دوستی کی زیادہ عمیق اور وسیع کوشش کی جاتی تو آپ کو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دیرپا کامیابی حاصل ہوتی جو حاصل ہوئی ہے، اس سلسلہ میں آپ کی مجبوریوں اور دشواریوں کا مجھے احساس ہے جو آپ کو اتنے بڑے ملک کی ان نازک حالات میں قیادت وانتظام میں پیش آرہی ہیں، لیکن میری شروع سے یہ مخلصانہ رائے رہی ہے کہ آپ کو خدا نے جو غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں عزم صحیح اور جلد فیصلہ کرنے کی جو قابلیت عطا کی ہے، اس سے آپ ان مشکلات پر غالب آسکتی ہیں۔" (۱)

آگے ملاحظہ فرمائیں:

"میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ ایمرجنسی میں بڑی تعداد میں لوگوں

---

(۱) کاروان زندگی: ۲/ ۲۱۶-۲۱۷

کی گرفتاری، پریس اور اظہار رائے کی آزادی پر (جو ہندوستان کا شروع سے طرۂ امتیاز رہا ہے) پابندی عائد کرنا، آپ کے مزاج، تعلیم و تربیت، خاندانی روایات اور اصلی جذبات کے سراسر خلاف ہے، اور آپ نے اس کو بالکل وقتی طور پر شدید مجبوری سے اختیار کیا ہے، اور جس لمحہ ملک کے حالات درست ہو جائیں گے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی، آپ اسی لمحہ اس کو ختم کر دیں گی، اس کے صحیح وقت اور حد کا تعین وہی کر سکتا ہے جو اندرونی حالات اور ملک کے حقائق سے واقف ہو، اور اس بارے میں ہم سب کو آپ پر اعتماد کرنا چاہیے، لیکن اس بات کے اظہار میں کوئی حرج نہیں کہ ہم سب کی تمنا ہے کہ وہ وقت جلد آئے، حالات معتدل اور نارمل ہوں، لوگوں کو اظہار خیال کی وہ آزادی ملے جس پر ہم نے ہمیشہ باہر کے ملکوں میں فخر کیا ہے، اور زندگی کی وہ گرمی اور نرمی محسوس ہو جو ایک زندہ جسم کی خصوصیت و سلامت اور جینے کا لطف و قیمت ہے، اس سلسلہ میں اتنا کہنے کی اور اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کے بغیر علم و ارادہ کے ان گرفتاریوں میں بڑی بے احتیاطی اور ایک حد تک بڑی زیادتی ہوئی ہے، ان لوگوں نے جو شریفانہ جذبات سے عاری تھے اور جن کی بہت سی اغراض وابستہ تھیں، اس غیر متعدل صورت حال سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا اور بہت سے ناکردہ گناہ گرفتار ہوئے، ان سے متعلق ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہو گئے، دن رات وہ فریاد کرتے ہیں، ملک جس اخلاقی پستی کے راستہ پر جا رہا تھا، اور ضمیر جتنا بے حس اور مردہ ہو گیا تھا، اس کے پیش نظر یہ بات نہ مقامی حکام سے بعید ہے، نہ عام پبلک سے، میں آپ کو اس سلسلہ میں بڑی حد تک مظلوم بھی سمجھتا

ہوں کہ آپ کو انتظامیہ کے ذمہ داروں نے بالارادہ یا بلا ارادہ بہت بدنام کیا، ہندوستان کی پبلک جو ہمیشہ سے محبت کی قدر دان بلکہ پرستار رہی ہے، آپ کو اس ملک کی نہ صرف سب سے بڑی بااختیار ہستی سمجھتی ہے، بلکہ آپ سے توقع رکھتی ہے کہ آپ اس کے حق میں ایک شفیق ماں بھی ثابت ہوں، اور بہت سے وجوہ سے ان کی یہ توقع حق بجانب ہے، کاش کہ آپ ان معصوم بچوں اور بے زبان عورتوں کی آہیں سن سکتیں جن کے بہت سے ناکردہ گناہ اعزہ اور سرپرست جیلوں میں ہیں، اور ان کی کوئی شنوائی نہیں۔''(۱)

اس کے آگے بڑی جرأت وقوت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ وہ اخلاقی گراوٹ ہے جو لالچ یا خوف سے ایک ایسے ملک میں پیدا ہوسکتی ہے، جس میں تعلیم وتربیت کی پہلے بھی کمی تھی، اسکا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہل ملک اس خودداری وخوداعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے جارہے ہیں، جو آزادی کی تحریک، کانگریس وخلافت کی جدوجہد، گاندھی جی، مولانا آزاد، علی برادران، نہرو خاندان اور ہمارے قابل احترام سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے بڑی قربانیوں سے اس ملک میں پیدا ہوئی تھی، سارا ملک اپنے کو غلام، بے بس اور ذلیل محسوس کررہا ہے، اور اس کو شاید ہی کسی وقت یہ محسوس ہوتا ہو کہ یہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے، جو ہر قسم کے جبر وتشدد سے محفوظ ہے۔''(۲)

حضرت مولانا نے ہر جگہ یہی طریقہ کار اختیار کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سخت سے سخت ذہن رکھنے والے بھی سوچنے پر مجبور ہوئے اور پوری طرح نہیں تو کچھ نہ کچھ ان

(۱) کاروان زندگی: ۲/ ۲۱۷-۲۱۸ (۲) کاروان زندگی: ۲/ ۲۱۹

کی ذہنیت ضرور تبدیل ہوئی، اندرا گاندھی خود مولانا سے ملنے رائے بریلی مولانا کی قیام گاہ پر آئیں اور مولانا سے نصیحت کی طلبگار ہوئیں۔

راجیو گاندھی

راجیو گاندھی کے زمانہ میں سپریم کورٹ نے نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں اپنا وہ فیصلہ دیا جس میں دین کی کھلی مداخلت تھی، اس مقدمہ میں جو ''محمد احمد خان اپیل کنندہ بنام شاہ بانو بیگم'' کے سلسلہ میں دائر تھا یہ فیصلہ دیا گیا کہ سابق شوہر مطلقہ بیوی کو تاحیات یا تا نکاح ثانی نفقہ دینے کا پابند ہے، اور اس میں قرآن کی اس آیت ''وللمطلقات متاع بالمعروف'' کا یہی مطلب بیان کیا گیا۔

اس فیصلہ نے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، مسئلہ صرف ایک فیصلہ کا نہیں تھا بلکہ مسئلہ شریعت کے تحفظ اور اس ملک میں اس پر عمل کی آزادی کا تھا۔ آج سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا، کل وہ اسی طرح کے اور اس سے بڑھ کر ایسے فیصلے دے سکتا تھا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا ملّی تشخص مشکوک ہو کر رہ جاتا۔ پرسنل لا بورڈ نے حضرت مولانا کی قیادت میں کمان سنبھالی اور پورے ملک میں اس کے خلاف ایسے عظیم الشان احتجاجی جلسے کیے گئے اور لاکھوں لاکھ فرزندان توحید نے دستخطی مہم چلا کر صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم و وزیر قانون سے اپنے ایسے احتجاج کا اظہار کیا کہ پورا ملک ہل گیا۔ خود صدر بورڈ کے وطن رائے بریلی میں اس سلسلہ کا عدیم المثال اجلاس منعقد ہوا، اتنا بڑا مجمع شاید اس سے پہلے رائے بریلی کی سرزمین پر نہیں ہوا تھا۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے پورے ملک کے دورے کیے اور لوگوں میں ''تحفظ شریعت'' کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا کہ اس سے پہلے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ

> ''سفروں کے دوران اسٹیشنوں پر مسلمانوں کی بھیڑ ہوتی تھی، لوگ آتے اور کہتے کہ شریعت کے لیے جان حاضر ہے، مال حاضر ہے''۔

ان احتجاجی مظاہروں کے علاوہ بورڈ کے ذمہ داروں نے اس وقت کے وزیر

اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقاتیں بھی کیں، اور ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس فیصلہ پر نظر ثانی کریں، کاروان زندگی میں حضرت مولانا لکھتے ہیں:

"میں نے راجیو جی سے کہا کہ راجیو جی! جس طرح رسم الخط (SCRIPT) کا ایک شارٹ ہینڈ ہوتا ہے، اسی طرح پالیٹکس کا بھی ایک شارٹ ہینڈ یا شارٹ کٹ ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن کا مسئلہ ہے، اس کو ان کے مخلص و مستند لوگوں سے سمجھ لیا جائے، قبل اس کے کہ وہ سیاسی پالیٹیشینز کے ہاتھوں جانے پائے اور وہ اپنے سیاسی مقاصد اور مفادات کے لیے اس کو طوالت دیں، اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجیو جی کے یہ بات سمجھ میں آ گئی، انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص پیشہ ور سیاسی اور کوئی گھاگھ لیڈر نہیں ہے، جب پارلیمنٹ میں ایسے بل پیش کرنے کا ذکر آیا جس سے سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ (جس کے اوپر ہندوستان میں کوئی عدالت نہیں) کالعدم ہوسکتا ہو تو راجیو جی نے معذرت کے انداز میں کہا کہ بعض قانونی مجبوریوں کے باعث آرڈیننس نہیں آسکا، اب بل پارلیمنٹ میں آجائے گا۔" (۱)

وزیراعظم نے ان ملاقاتوں سے مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کا اندازہ کرلیا اور یہ بھی محسوس کرلیا کہ اس تحریک کے قائدین مخلص اور بے لوث ہیں۔ صدر بورڈ سے خود موصوف نے خواہش ظاہر کر کے دو ایک مرتبہ تنہائی میں بھی گفتگو کی۔ حضرت مولانا نے اپنے داعیانہ مزاج کے ساتھ حکمت و بصیرت سے بھرپور گفتگو فرمائی، جس سے وزیراعظم پر گہرا اثر پڑا، اور انہوں نے یہ طے کرلیا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ سے اس میں تبدیلی کرنی ہے۔ مسئلہ بڑا نازک بن گیا تھا، پورا پریس اور میڈیا کورٹ کے فیصلہ کو بالکل مبنی بر انصاف اور حق بجانب قرار دے رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ ایک چھوٹے سے

(۱) کاروان زندگی: ۱۳۲/۳-۱۳۳

مسئلہ کے لیے جس میں ایک مظلوم عورت کو نفقہ دلایا جارہا ہے بورڈ کیوں اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور کیوں اس میں تبدیلی چاہ رہا ہے؟ لگتا تھا کہ پورے ملک میں ایک ہی معرکہ گرم ہے۔ بورڈ کے قائدین اگر اس معاملہ میں حکمت سے کام نہ لیتے تو مسئلہ شاید نہ حل ہو پاتا مگر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں اور خاص طور پر وزیر اعظم کو اعتماد میں لینے کی وجہ سے گتھی سلجھتی ہوئی نظر آرہی تھی کہ اچانک کسی نے وزیر اعظم کو یہ سمجھا دیا کہ اس سلسلہ میں دوسرے مسلمان ملکوں کے قانون کو بھی دیکھ لیا جائے، اگر وہاں اس طرح کی تبدیلیاں شریعت کے خلاف ملتی ہوں تو یہ ایک سیکولر ملک ہے، یہاں اس میں کیا حرج ہے؟ حضرت مولانا کو اس کا علم ہوا تو قبل اس کے کہ وزیر اعظم کی طرف سے کوئی بات آتی خود حضرت مولانا نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور فرمایا:

> ''راجیو جی! آپ کے ملک کو اللہ نے خود کفیل بنایا ہے، اس کو کسی دوسرے ملک کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، شریعت کے مسئلہ میں بھی یہ ملک خود کفیل ہے، اور یہاں کے علماء کی دنیائے اسلام میں وہ اہمیت ہے کہ ورلڈ مسلم نیشن (رابطۂ عالم اسلامی) جو سب سے بڑی اسلامی آرگنائزیشن ہے اس میں متعدد مرتبہ دنیا کے کئی علماء ایک طرف ہوئے اور آپ کے ملک کے عالم نے اس کے خلاف بات کہی تو اس کی بات مانی گئی، اس مسئلہ میں بھی دوسرے ممالک کی طرف نگاہ کرنا اس ملک کی توہین ہے، اگر میں ایک بار آپ سے یہ بات کہوں تو آپ چار بار کہیں۔'' (۱)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد پھر کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی اور راجیو جی کا ذہن بالکل صاف ہوگیا۔ اس مسئلہ میں انھوں نے ان حضرات سے بار بار تفصیل سے وضاحت سنی اور خود بھی مطالعہ کیا، یہاں تک کہ خود انھوں نے اپنی

(۱) راقم سطور نے خود حضرت مولانا سے یہ گفتگو سنی ہے، کوشش کی ہے کہ خود حضرت مولانا کے الفاظ میں ہی اس کو نقل کر دیا جائے۔

کسی تقریر میں یہ بات کہی کہ ''اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ کسی مذہب نے نہیں دیئے''۔ اس طرح وہ خود اس مسئلہ کے ترجمان بن گئے اور انھوں نے طے کرلیا کہ اس فیصلہ کے خلاف پارلیمنٹ میں بل پیش کیا جائے گا۔ اس کے لیے انھوں نے ۵ر مئی ۱۹۸۶ء کی تاریخ طے کردی۔ باہر کی فضا چونکہ ناسازگار ہورہی تھی۔ خود کانگریس کے متعدد ممبران کے ذہن صاف نہیں تھے اس لیے راجیو جی نے باقاعدہ ''وہپ'' جاری کردیا کہ تمام ممبران کے لیے حاضر ہونا اور بل کی تائید کرنا لازم ہے ورنہ وہ رکنیت سے نکال دیا جائے گا۔ ۵ر مئی ۱۹۸۶ء کو بل پیش ہوا۔ طویل اور گرما گرم بحث کے بعد رات کو دو بجے ووٹنگ ہوئی اور بل پاس ہوگیا اور ''ویومئذٍ یفرح المؤمنون'' (اور وہ دن مسلمانوں کی خوشی کا ہوگا) کا اظہار ہوا۔

یہ بورڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی جس میں حضرت مولانا کی حکمت اور فہم و فراست کو خاص دخل تھا۔ حضرت مولانا نے بل پاس ہونے کے بعد راجیو جی کو شکریہ کا ایک خط بھی لکھا جس میں شکریہ کے ساتھ ساتھ ان کو ملک کے سامنے پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا، فرقہ واریت، اونچ نیچ اور دوسرے مسائل کی طرف ان کو متوجہ کیا اور ان کی ذمہ داری ان کو یاد دلائی۔

وی پی سنگھ

وی پی سنگھ جب یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے تو مرادآباد کا سخت فساد ہوا، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک جلسہ میں وہ بھی موجود تھے، مولانا نے کھل کر ان کی گرفت کی، مگر اسی حکمت کے ساتھ، راقم سطور وہاں حاضر تھا مولانا کے جملے کانوں میں گونج رہے ہیں:

''میں وی پی سنگھ جی کا گریبان تو نہیں پکڑ سکتا مگر ان کا دامن پکڑ کر کہہ سکتا ہوں''

وی پی سنگھ نے وہیں سر جھکا دیا، اور مولانا نے سب کچھ کہا، اس کے بعد اس پر یہ اثر پڑا کہ وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بار بار مولانا سے ملنے آتا رہا

اور ایک دفعہ خود اس نے مولانا سے کہا کہ میں جب کوئی اسپیچ دینے جاتا ہوں تو پہلے ان کا کوئی پمفلٹ پڑھ لیتا ہوں، ایک انٹرویو میں اس نے یہ تک کہا کہ میں مولانا کے خوابوں کا ہندوستان دیکھنا چاہتا ہوں۔

اٹل بہاری واجپئی

اٹل بہاری واجپئی جب مولانا کی عیادت کے لیے ندوہ آئے تو اس وقت بھی حضرت مولانا نے ان کو ملک کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ یہ ملک ایک جہاز کی طرح ہے، ہم سب اس کے سوار ہیں، اگر یہ ڈوبا تو نہ ہم بچیں گے، نہ آپ بچیں گے، ہم سب کی ذمہ داری ہے، ہم اس کو اخلاقی بلندی اور انسانیت نوازی کے راستہ پر لے جائیں اور جو لوگ اس کے ساتھ کھلواڑ کرنا چاہتے ان سے ہوشیار رہیں۔

آخری بات

ہوسکتا ہے کہ کسی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ان سب کوششوں کا حاصل ہی کیا ہوا، آج جو ملک کے حالات ہیں وہ اور زیادہ بگڑ چکے ہیں، مگر ایسا سوچنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ حالات بہت پہلے پیدا ہونے والے تھے، یہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب تک وہ سازشیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکیں، آج ان کوششوں کی ضرورت بہت زیادہ ہے اور الحمدللہ اب خاص وعام کو اس کا احساس بھی ہے، مگر جب تک وسیع پیمانہ پر جگہ جگہ ہر سطح سے یہ کام نہیں ہوگا، اس وقت تک بڑے پیمانہ پر نتائج کی بھی توقع مشکل ہے، اور جہاں جہاں یہ کام ہو رہا ہے، اس کے نتائج بھی الحمدللہ سامنے آرہے ہیں۔

مولانا کی یہ حکمت دعوت ہر ملک اور ہر دور کی ضرورت ہے، پہلا مرحلہ اختیار کیے بغیر آگے بڑھ جانا، حقیقت میں دعوت کے کام کو کھوٹا کردینے کے مترادف ہے۔

محبت میں جو چاشنی ہے وہ سخت سے سخت دل رکھنے والے کو بھی موم کرسکتی ہے، اور اس کو اپنا بنا سکتی ہے، البتہ آنکھیں کھلی رکھی جائیں، چیلنجز کو سمجھا جائے، سازشوں کو بے نقاب کیا جائے۔